

محنت سے نعمت تک

میری زندگی کا سفر



یونس چودھری

محنت سے نعمت تک

میری زندگی کا سفر

مصنفہ

یونس چودھری

مترجم

مبشر احمد

نام کتاب	:	محنت سے نعمت تک (انگلش سے ترجمہ)
مصنف	:	یونس چودھری
مترجم	:	مبشر احمد
سن اشاعت	:	2020ء
تعداد	:	1000
رابطہ	:	

Mubasher Ahmad
15000 Good Hope Road,
Silver Spring, MD 20905, USA
Ph. +1-630 229 9782
mubahmad@aol.com

Mehnat Se Nemat Tak

A Journey of My Life

By

Younas Chaudhary

موضوعاتی ترتیب سے



صفحہ نمبر	مضمون	نمبر شمار
5	پیش لفظ	✽
10	ایک عاجزانہ آغاز	1
38	لڑکپن سے جوانی تک	2
52	خوش آئند شادی	3
73	ایک چھت کے تلے جداگانہ زندگیاں	4
91	تیس ڈالرز اور ایک خواب	5
130	تجاہل غیر عارفانہ	6
153	اپنے تیل کا پہلا کنواں	7
162	مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں	8
178	احمدی ہونے کی وجہ سے میرا والد قید خانہ میں	9
189	محبت سب سے، نفرت کسی سے نہیں	10
195	بڑی حویلی	11
206	طوفان ہاروی کی تباہ کاریاں	12
210	جماعت احمدیہ کی خدمت میں نذرانہ	13

214	دماغ غیر مصفّٰا۔ پارکنسن اور نسیان	14
229	رہنمائی بذریعہ رجائیت	15
236	محنت اور مجموعی سے کام کا حاصل	16
240	حرفِ آخر	17
246	میرے عزیز واقارب کے آراء	18
274	یونس اینڈ بُشریٰ چوہدری فاؤنڈیشن	19



پیش لفظ

ایک دانا کا قول ہے: آپ اُس وقت تک یہ نہیں جان سکتے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں جب تک یہ نہ دیکھ لیں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔

یہ نچوڑ ہے میری زندگی کی کہانی کا۔

میں نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کامیا بیاں دیکھیں، میں یہ کبھی نہ بھولا کہ میری ابتداء کہاں سے ہوئی۔ یہاں سے آدھی دُنیا دُور، ایک غربت زدہ دیہات کا رہنے والا تھا۔ اتنا چھوٹا دیہات کہ اُس کا کوئی نام تک بھی نہ تھا۔ صرف 99-6/R ایک نمبر تھا۔

جب میں بڑا ہو رہا تھا تو بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میرا بھی کوئی نام نہیں۔ گرد آلود کچی مٹی کے راستوں پر چلنے والا ایک غربت زدہ پاکستانی دیہاتی ہوں، اور میری باقی تمام عمر یوں ہی گزر جائے گی۔ لیکن میرا حوصلہ بلند تھا، ایمان پختہ، خاندان مضبوط۔ کچھ خوش قسمتی نے ساتھ دیا اور کچھ وقت کی مناسبت نے۔ ان سب نے مل کر مجھے ساہیوال کے نزدیک دیہات نمبر 99-6/R سے باہر نکالا اور میں اپنی تصوراتی جنت میں آ پہنچا، جس کا دوسرا نام ہوسٹن، ٹکساس، ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔

آئندہ صفحات پر آپ دیکھ لیں گے کہ مجھے زندگی میں کامیابی آسانی سے نہیں ملی اور نہ ہی بلا قیمت ملی ہے۔

سال 2012 میں میری بیوی بشریٰ نے اپنے دائیں کندھے میں تکلیف کی شکایت سے مجھے آگاہ کیا۔ بعد میں وہ تکلیف بڑھنا شروع ہو گئی اور اُس میں ایک تواتر آگیا اور پھلتے پھلتے وہ درد کندھے، گردن اور پیٹھ تک جا پہنچا اور آخر کار آہستہ آہستہ تمام جسم ہی درد آلود ہو گیا۔ ان دردوں کی تکلیف سے پہلے بشریٰ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ایک دن پارک میں حسب معمول سیر کرتے ہوئے بشریٰ کو اچانک ٹھوکر لگی اور خراش آ گئی۔ بعد میں جب میں نے اس واقعہ کے بارے پوچھا تو اُس نے انتہائی سادگی سے جواب دیا:

”مجھے تو کچھ یاد نہیں!“

اس بات پر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اُسے جو کچھ ہو رہا تھا وہ ایک تشویشناک امر تھا۔ اور یہ بات ظاہر ہونا شروع ہوئی کہ بشریٰ کو دماغی عارضہ نے آلیا ہے اور اُس کی یادداشت کمزور ہونا شروع ہو گئی ہے اور وہ چیزوں کو بھولنے لگی ہے۔ مزید یہ کہ اُس کے ہاتھوں اور آنکھوں کا باہمی ربط بھی متاثر ہونا شروع ہو گیا۔ اور دماغی نظام میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔

میں اُسے مختلف ڈاکٹروں کے پاس دکھانے لے گیا مگر ہر ایک نے الگ الگ رائے دی۔ ایک نے کہا کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی مڑ گئی ہے، دوسرے نے رائے دی کہ جسمانی معالجہ کروایا جائے اور تیسرے نے تشخیص کی کہ پریشاں دماغی کے آثار ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہم سب قریبی رشتہ دار سخت تذبذب کی حالت میں تھے اور کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں!

میں اپنی بیوی اور ہمارے بچے اپنی پیاری ماں کی صحت کو اپنی آنکھوں کے سامنے گرتے ہوئے دیکھتے رہے جو کہ آہستہ آہستہ خراب سے خراب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آخر 10 جون 2014ء کو تشخیص ہوئی کہ بُشریٰ کو رعشہ (Parkinson) کی بیماری ہے جو کہ ایک شدید صدمہ تھا۔ کئی دنوں تک میں تنہائی میں روتا رہا۔

میری بیوی، میری ہمدرد اور انتہائی مددگار، ہمارے چار پیارے بچوں کی تربیت کرنے والی، پھر آگے اُن کے سات بچوں کے پالنے میں اُن کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن وہ اب ہم سب کی آنکھوں کے سامنے اپنی صحت اور حافظہ کھو رہی تھی۔

اب میں بُشریٰ کی روزمرہ ضروریات کا خیال رکھتا ہوں۔ وہ گھر میں ہوتی ہے، مگر اپنی ہی دُنیا میں گم رہتی ہے۔ اگر بچے اُسے ملنے آجائیں تو بہت لطف اندوز ہوتی ہے لیکن کسی بامعنی گفتگو کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور یہ ایک انتہائی شدید بُشریٰ اور اُسکی یادداشت کی کمی اور رعشہ کی بیماری کا مقابلہ ہے۔ 2014 میں میں نے ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ زندگی کے خصوصی حالات کو قلم بند کرنا ضروری ہے تاکہ اپنی زندگیوں کے اچھے اور بُرے اوقات یاد رہیں۔ اب اُس کی بیماری کی وجہ سے مجھے کام سے فراغت اور تنہائی میسر آ گئی ہے۔

پاکستان میں ایک عاجزانہ ابتداء سے بُشریٰ اور میں نے باہم مل کر ایک کامیاب و کامران زندگی کا سفر شروع کیا۔ خدا کے فضل سے مجھے ایک بہت ہی کامیاب کاروبار شروع کرنے اور اُسے آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ ہمارے چار قابلِ ستائش

بچے اور اُنکے آگے سات پیارے پیارے بچے ہیں۔

میں چاہتا تھا کہ ہمارے تمام افرادِ خاندان کو ہماری زندگیوں کے بارہ میں علم ہو اور خصوصاً ہمارے بچوں کو پتہ چلے کہ زندگی میں کامیابی آسانی سے نہیں ملتی۔ بعض اوقات جسمانی محنت مزدوری بھی کرنا پڑتی ہے۔ میں نے در در جا کر برتن بیچے، ٹیکسی چلائی، بُوچر خانہ میں گوشت کاٹا اور ایک بار ہسپانوی (Hispanic) مزدوروں کو یقین دلانا پڑا کہ میں ہسپانوی نہیں ہوں۔ (تفصیل بعد میں آئے گی)۔

اس کتاب کے لکھنے سے میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ میرے حالاتِ زندگی مطالعہ کر کے میرے تجربات سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ علاوہ ازیں ایک دوسری وجہ اس کتاب کے لکھنے کی یہ بھی ہے (جسے بعض احباب خود غرضانہ سمجھیں) کہ میں نہیں چاہتا کہ میری یاداشتیں میرے ذہن سے نابود ہو جائیں۔

اس کتاب میں آپ میری زندگی کے سفر کا مطالعہ کریں گے جو پاکستان کے ایک چھوٹے سے دیہات کی گرد آلود کچی مٹی کی سڑکوں سے شروع ہو کر ٹیکساس کی تیل اُگلتی زمین تک کا ہے۔ بظاہر یہ یہاں آنے والے مہاجرین کی پہلی نسل کی کاوشوں کی ایک عمومی کہانی یا زمین کی کھدائی سے پٹرول حاصل کرنے والے ایک کامیاب تاجر کی داستان نظر آئے گی، مگر میں نے اس کتاب میں قدرے گہرائی میں جا کر پاکستان میں خواتین کے بنیادی حقوق کی تلافی اور وہاں ہونے والی مذہبی بے انصافی سے بھی پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔

مجھ سے اکثر یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ میں گیس اور تیل کی تجارت میں کیونکر آ گیا اور اس میں کامیابی کیسے حاصل کر لی۔ میرے پاس اپنی کامیابی کا کوئی پوشیدہ راز نہیں، ماتِ صرف یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ مستقل مزاجی، پوری توجہ اور مثبت ذہنی فکر کے ساتھ محنت و مشقت کرتا چلا جاؤں اور اپنی راہ میں کسی بھی مشکل کو روک نہ بننے دوں۔

میرے لئے یہ کتاب لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بعض دردناک یادوں کے دریچے کھل گئے اور بعض اوقات لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول بھی کھلے۔ لیکن میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں میں نے اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کتاب میں بعض لوگوں کے نام بدل کر لکھے ہیں تاکہ جس کا بھی میرے ساتھ واسطہ پڑا ہے اُن میں سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

میں تمام احباب کی خدمت میں کہ جن کا کسی طور سے میری زندگی اور میرے دل سے رابطہ رہا ہے اور جنہوں نے مجھے وہ شخص بنانے میں مدد دی جو کہ آج میں ہوں، عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں بہت ہی محبت اور انکسار کے ساتھ آپ سب کا ممنون احسان ہوں۔ خُدا سب کو جزائے خیر دے اور اگر میں نے کبھی کسی کا دل دکھایا ہو، چاہے وہ موجود ہو یا نہ ہو، میں مُخلصانہ طور پر اُن سے معافی کا درخواستگار ہوں کیوں کہ قطعی طور سے میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا کہ کسی کا دل دکھاؤں۔



ایک عاجزانہ آغاز

میری پیدائش 1952 کے گرمیوں کے موسم میں ایک روایتی پاکستانی گھرانے میں ہوئی جو کہ پنجاب کے جنوب میں ساہیوال (جس کا دوسرا نام ٹنگمری بھی ہے) کے قریب دھوپ میں جلتے ہوئے ایک چھوٹے سے دیہات میں آباد تھا۔ یہ دیہات ایک تاریخی شہر ہڑپہ کے کھنڈرات سے پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہڑپہ ایک بہت ہی پرانی تہذیب کی نشاندہی کرتا ہے جو کہ آٹھ ہزار سال قبل وادی ہند میں قائم تھی۔ تاریخ دانوں کے اندازہ کے مطابق کانسی کے زمانہ میں یہاں ایک عظیم الشان تجارتی شہر آباد تھا جس میں ہر قسم کے معاشی کاروبار اور متعدد انداز کی تحریرات رائج تھیں۔

اس کے بالمقابل بیسویں صدی کے نصف تک میرا خوابیدہ گاؤں ایک گمنامی کے عالم میں تھا اور دور دور تک کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کدھر ہے۔ اس گاؤں میں 1960 کے آخر تک نہ بجلی تھی اور نہ بہتا ہوا صاف پانی۔ نہ وہاں کوئی بدزواور نہ کوئی ہموار سڑک۔ وہ گاؤں ایک بڑی نہر کے قریب واقع تھا اور نزدیک سے ریل گاڑی کی ایک پٹری گزرتی تھی اور صرف ایک پختہ سڑک تھی جو ہمیں ایک شاہراہ تک لے جاتی تھی۔

میرے گاؤں میں رہنے والے اکثر لوگ غریب تھے اور تقریباً تمام کے تمام ہی

اُن پڑھ۔ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے سکول بھیجنے میں اُن کو قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور لڑکیوں کو تعلیم دلوانا تو ان کے لیے ایک ناقابلِ فہم بات تھی۔ گرمیوں میں شدید گرمی پڑتی اور اکثر اوقات درجہ حرارت 113 ڈگری فارن ہائٹ تک جا پہنچتا تھا۔ گرمی کے دنوں میں دیہاتی ایک خود ساختہ پانی کے نالہ کے قریب اکٹھے ہو جاتے اور اپنے جسموں پر کیچڑ بھرا گندہ پانی ڈالتے رہتے تھے۔ سورج کی بھسم کر دینے والی شعاعوں سے بچنے کی خاطر مرد صرف ایک ڈھیلی ڈھالی سوتی کپڑے کی تہ بند باندھتے اور ان میں سے اکثر گرتا یا قمیض نہ پہنتے تھے۔ یقین نہیں آتا کہ آج سے ساٹھ سال پہلے پاکستان کے دیہاتوں میں کوئی بھی ایسی سہولت میسر نہ تھی جس کا موجود ہونا آجکل ہم ایک لازمی امر سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیہاتوں میں کوئی بیت الخلا نہ ہوتا تھا۔ حاجت روائی کے لیے یا تو زمین میں سوراخ کھودنا پڑتا تھا، یا زمین پر ہی بیٹھ کر فارغ ہو جاتے اور مٹی یا جلی لکڑی کی راکھ ڈال کر اسے ڈھانک دیا کرتے تھے۔ کھانا پکانے کی آگ کے لیے بھی اُپلوں کو جلایا جاتا جو کہ گوبر اور گندم کے بھوسے کو آپس میں ملا کر اور خشک کر کے بنائے جاتے۔ یہ اُپلے گھنٹوں تک بغیر کسی بدبو کے جلتے رہتے اور اُن کی آگ پر نہ صرف کھانا پکتا بلکہ سردیوں میں انکی آگ ہاتھ تاپنے کے کام بھی آتی تھی۔

ہمارے گھر کے احاطہ میں پانی کا ایک کنواں بھی تھا جس میں سے ہمیں خود اپنے ہاتھوں سے پانی نکالنا پڑتا۔ کنوئیں سے پانی نکال کر چھوٹے تالابوں میں بھر لیا کرتے تھے جو کہ چکنی مٹی یا سیمنٹ کے بنے ہوتے۔ اُن تالابوں کے اندر سیمنٹ اور باہر گیلی

ریت کا پلستر لگا ہوتا تھا۔ اُس کنوئیں سے چمڑے کے بنے ہوئے ڈولوں سے پانی نکالا جاتا جو کہ رسی سے بندھے ہوتے اور جنہیں ہم کنوئیں میں ڈال کر پینے کے لیے یا کھانا پکانے کے لیے پانی نکالنے کا کام لیتے۔ خصوصاً موسم گرما میں کنوئیں کا پانی بہت فرحت بخش ہوتا تھا۔ اُسی پانی سے ہم نہا بھی لیا کرتے اور ہمیں پانی کے اندر پلنے والے کیڑے مکوڑوں کا کبھی خیال تک بھی نہ آتا۔ اغلباً ہمارے جسم جراثیموں سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے اثر سے قدرتی طور پر محفوظ ہو چکے تھے۔ اُن تالابوں کے علاوہ جن میں جمع کردہ پانی ہم استعمال کرتے تھے ایک اور نچلا تالاب بھی تھا جس میں سے ہمارے جانور پانی پیتے تھے۔

گرمی میں تپتی ہوئی گرمی کا اثر دُور کرنے کے لیے گاؤں والے ہاتھ کے پنکھوں کا بھی استعمال کرتے جو کہ بانس کے خشک پتوں سے بنے ہوئے ہوتے۔ اُن پنکھوں کا ایک دستہ اور دندانہ بھی ہوتا۔ موسم گرما میں پنکھے جھلنے کا رواج عام تھا۔ جو دیہاتی قدرے مالدار ہوتے وہ ذرا بڑی جسامت کے پنکھے استعمال میں لاتے اور عام طور پر اُن کا کوئی نوکر اُن کو پنکھا جھلتا اوہ وہ پنکھے کی ہوا کی ٹھنڈک میں مزے سے بے کار بیٹھے رہتے۔ میں چونکہ ایک نوعمر بچہ تھا اس لیے میری قسمت میں یہ نہ تھا کہ کوئی مجھے بھی پنکھے کی ٹھنڈی ہوا دیتا۔

میرے روزمرہ کے کاموں میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ جاؤں اور بھینس کا دودھ دوہ کر لاؤں۔ یہ کام میرے لیے کافی مشکل تھا، خصوصاً گرمی کے دنوں میں۔ اکثر

اوقات دو دھڑکنے کا فریضہ ابھی آدھا بھی نہ ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں میں اکثر اوقات شروع ہو جاتی اور میں کچھ دیر ستانے کے لیے رُک جاتا، جس پر بھینس مجھے گھور کر دیکھتی گویا وہ کہہ رہی ہوتی کہ:

”اے لڑکے! تُو نے جو یہ کام شروع کیا ہے اب اسے ختم بھی کر!“

یا وہ مجھ سے پرے ہٹنا شروع ہو جاتی، شاید یہ سوچتے ہوئے کہ اس لڑکے کے پاس کافی فالٹو وقت ہے مگر میں نے کچھ کام بھی کرنے ہیں!

تقریباً سارا سال ہی اور خصوصاً گرمیوں میں جب بھی ہمیں سبزی کی ضرورت پڑتی تو ہم سبزی خریدنے کبھی کسی دکاندار کے پاس نہ جاتے، بلکہ کھیت میں جا کر وہیں سے گو بھی، پھلیاں اور جو بھی موسمی سبزی تیار ہوتی اُسے چُن لاتے۔ شام کے کھانے کا فیصلہ تو خصوصاً ایک ہی ساعت میں کر دیا جاتا۔ دو بجے بعد از دوپہر میرے والد صاحب فیصلہ فرماتے کہ آج شام کیا کھانا ہے۔ وہ کسی ایک بچے کو کچھ اس طرح مخاطب ہوتے:

”دیکھو! مرغیوں کے اجڑ کے درمیان وہ مرغی جو تمہیں نظر آرہی ہے، وہ

آج شام کا کھانا ہے۔ اب جاؤ اور اُس کو پکڑ لاؤ!“

میرے خیال میں مرغیوں کو بھی فوری طور پر خطرے کا احساس ہو جاتا تھا اور وہ ایک دم ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتیں اور دوڑتی ہوئی مرغی کو پکڑنا اتنا آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ وہ بہت تیز بھاگتی تھی۔ بہر حال ہم بھی پوری ہمت و طاقت سے اپنے شام کے کھانے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے جس میں اکثر اوقات کامیابی نصیب ہو جاتی۔

اس کام کی تکمیل کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ ہم مرغی کے پیچھے احاطہ میں اس قدر دیوانہ وار دوڑتے کہ آخر کار وہ بے چاری تھک جاتی اور ہمارے قابو آ جاتی۔ تھکی ہوئی مرغی سے پہلے اگر ہم تھک جاتے تو پھر کوئی نوکر مرغی پکڑنے کی دوڑ کو جاری رکھتا اور آخر کار کامیاب ہو جاتا۔ بہر صورت شام پانچ بجے کھانے کا دسترخواں لگ جایا کرتا تھا۔

یہی طریقہ بھیڑ بکری کا گوشت کھانے کا تھا۔ البتہ اُس کی تیاری میں وقت قدرے زیادہ لگتا۔ اُن دنوں گوشت کو متخستہ سرد خانے میں رکھ کر محفوظ رکھنے کا کوئی وسیلہ موجود نہ تھا اس لیے ہر ایک کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا اور اگر کبھی کھانے کے لیے بھینس ذبح کی جاتی تو پھر تو تمام گاؤں کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے کتوں کی بھی بھینس کی بڑی بڑی ہڈیوں سے تواضع ہو جاتی۔ پیٹ بھر کے کھانے کے بعد سب مزے سے سو جاتے۔

کھانا پکانے اور کھانے کی گفتگو کے ذکر میں پاکستانی ماحول کی ایک مخصوص بات کے بارہ میں میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ وہاں بھینس کا گوشت (جسے بڑا گوشت کہتے ہیں) صرف غریبوں کی خوراک سمجھی جاتی ہے۔ اگر کبھی آپ بڑا گوشت خریدتے نظر آ جائیں تو آپ کے ہمسائے آپس میں چہ میگوئیاں کرنا شروع کر دیں گے کہ خدا جانے آپ کے گھر کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ لیکن وہاں سے ایک دُنیا دور امریکہ میں اگر میں کسی قصاب کی دکان پر جا کر بڑے گوشت کی خشک بوٹیاں خریدوں تو کوئی بھی یہ تصور نہیں کرے گا کہ میں غربت کا مارا ہوا ہوں۔ اسے بھی زندگی کی ایک عجیب ستم

ظریفی ہی سمجھنا چاہیے۔

ساہیوال میں موسم سرما کی آمد انتہائی سخت خشک اور ہڈیوں تک کو منجمد کرنے والی سردی لے آتی تھی جس میں انسانی روح تک کو کپکپی لگ جاتی۔ بڑی عمر کے دیہاتی نہر کے کنارے بیٹھ کر دھوپ سینکتے اور سردی کی شدت سے بچنے کی کوشش کرتے۔ اکثر اوقات نہر کے کناروں پر وہ اپنی اپنی نشست کی جگہیں صبح سویرے ہی پکڑ لیتے۔ وہیں ناشتہ کرتے۔ حقہ پیتے، گپ بازی کرتے اور سورج کی تپش کی تعریفیں کرتے جو کہ ان کے جسموں کو گرم رہی ہوتی۔

دیہات میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی تفریح کے سامان کا فقدان تھا رات کے وقت گھر کے مختلف حصوں میں مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹینوں کا استعمال کیا جاتا اور انہی کی روشنی میں مطالعہ اور سکول کا کام ہوتا تھا۔

میرے دادا محترم چوہدری اسماعیل صاحب نے 1947 میں انڈین رائل آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس علاقہ میں آکر گاؤں کی بنیاد رکھی اور یہیں آکر آباد ہو گئے۔ اُن کا بہت بڑا گھرانا تھا۔ پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں سب اُن کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ بیٹیاں تو شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں مگر اُن کے پانچ بیٹے اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ تمام عمر اُس ہی مکان میں رہتے رہے۔

اس طرح ایک گھرانے کے کثیر التعداد رشتہ داروں کے درمیان رہتے ہوئے میں بڑا ہوا۔ میرے والد کے تمام بھائی، چچیاں، چچا زاد بھائی اور چچا زاد بہنیں سب ہی اُس

وسیع مکان میں رہائش پزیر تھے جس کو حویلی بھی کہا جاتا تھا۔ ہماری حویلی کے گرد دس فٹ اونچی دیوار تھی جس پر خوبصورت نقش و نگار کا کام کیا گیا تھا۔ اُس چار دیواری کے اوپر تیز دھاری شیشوں کے ٹکڑے بھی لگائے گئے تھے تاکہ رات کو کوئی چور دیوار پھلانگ کر حویلی میں نہ گھس آئے۔ کیونکہ اس طرح سے ہونے والی چوریوں کی واردات دیہاتوں میں عام تھیں۔ گرمی کے دنوں میں کبوتروں اور دیگر پرندوں کے جھنڈ گھر کے اندر آ کر اکثر اپنے گھونسلے بنانے کی جگہ بھی تلاش کر لیا کرتے تھے۔

میرے دادا ایک زمیندار تھے اور جو گاؤں انہوں نے آباد کیا تھا اس کے گرد و نواح میں بہت ساری زمین اُن کی مالکیت میں تھی۔ انہوں نے گھوڑے، بچھڑے، بیل، گائیں، بھینسیں، بھیڑیں، بکریاں اور کتے پال رکھے تھے۔ دن کے وقت تمام جانور حویلی سے باہر کھیتوں کی زمین پر لے جائے جاتے تاکہ چارہ چر سکیں اور ادھر ادھر چل پھر سکیں۔ رات پڑنے پر سب واپس حویلی میں لائے جاتے تاکہ آرام کر لیں۔

میرے بچپن کا اکثر حصہ حویلی کے اندر ہی گزرا جہاں ہمارے خاندان کی رہائش کے لیے ایک حصہ مخصوص تھا۔ میرے بچپن کے دنوں میں گاؤں کے لوگوں کی رہائش انکے جانوروں کے قریب ہی ہوا کرتی تھی اور ہمارا خاندان بھی اسی طرح رہتا تھا اور جانوروں سے نکلنے والی متواتر بدبو ہمیں تنگ نہ کرتی تھی۔ کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ وہ جانور ہمارے روزگار کمانے میں مددگار ہیں۔ ہمارے گھر کی خواتین نوکرانیوں سے بھی کام لیتیں، جنہیں جھاڑو والیاں کہا جاتا تھا۔ وہ ہمارے گھر کے فرش صاف کرتیں، مٹی کے

گھڑوں میں پانی بھرتیں اور اسی طرح کے اور بھی کئی کام کرتیں۔ کھانا پکاتیں اناج کے دانے کوٹتیں اور کھانا تیار کرنے کے واسطے سبزیاں وغیرہ کاٹا کرتی تھیں۔

مغربی ممالک میں بچوں کی پیدائش اکثر اوقات کسی ہسپتال میں ہوتی ہے، لیکن میری پیدائش تو گھر ہی میں ہوئی تھی۔ میرے بچپن کا شروع زمانہ گاؤں ہی میں گزرا۔ میں ایک خاموش، شرمیلا اور ڈرپوک سا بچہ تھا جسے گاؤں کی مصروف زندگی پسند نہ تھی۔ میرے گاؤں کے اکثر لڑکے جھگڑالو، بے ہودہ اور سخت مزاج تھے۔ اور لڑائی مار کٹائی میں مصروف رہتے۔ اور میں حیران و پریشان رہتا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں کیوں لڑنے لگتے ہیں۔ بالغ مردوں کا حال تو ان سے بھی بدتر تھا۔ اونچی آواز میں بات کرتے، لڑتے اور گندی زبان استعمال کرتے کہ جیسے کوئی نشہ آور چیز کھائی ہوئی ہو۔ مجھے اپنے بچپن میں دیہاتی زندگی سخت افراتفری کے عالم میں نظر آتی تھی۔ وہاں کوئی خوشگوار، دوستانہ، محبت بھرا اور پُر امن ماحول نہیں تھا۔ ساٹھ سال گزرنے کے بعد اب بھی میں جب وہاں کے حالات کے بارہ میں سوچتا ہوں تو بعض ناخوشگوار یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ تاہم میں اپنے بچپن کے تجربات کا زیر احسان بھی ہوں جنہوں نے مجھے وہ انسان بنانے میں مدد دی جو کہ میں آج ہوں۔

ہم اپنے دادا کی وجہ سے ساہیوال کے قریب اُس چھوٹے سے گاؤں میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ہمارے دادا پاکستان میں سیالکوٹ کے ایک علاقہ بنام کھٹ کھوڑا سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے کئی سالوں تک انڈین رائل برٹش آرمی میں ملازمت کی

تھی اور انگریزوں نے اُنکی وفادارانہ خدمات کے عوض 1947 میں ساہیوال (منگلگری) کے قریب ایک بڑا قطعہ زمین بطور انعام دیا تھا اور وہ وہاں کے لمبردار تھے۔ دیہات نمبر 99-6/R کے تین اطراف میں اکثر زمین اُن ہی کی تھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ میرے دادا کے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ میرے والد محمد اسحاق چوہدری اُن کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ رواج کے مطابق سب سے بڑے بیٹے کا تمام گھرانے والے خاص احترام اور خیال رکھتے تھے۔ 1957 میں میرے دادا پھیپڑوں کی بیماری کے باعث پچاسی سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ اُن کی وفات نے ہماری زندگیوں کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل ڈالا۔ اُس وقت میرے والد پاکستان ایئر فورس میں ملازم تھے اور ان کا تعین سرگودھا میں تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت سے قبل از وقت سبکدوشی کا فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں جا کر آباد ہوں اور وہاں حاکم لمبرداری کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ بڑے بیٹے ہونے کے باعث نہ صرف یہ ان کی عزت افزائی تھی بلکہ اُن کا یہ فریضہ بھی تھا کہ خاندانی روایت اور وقار کو قائم رکھیں۔ اس کے بعد انہیں اپنے چھوٹے بھائیوں کا خیال بھی رکھنا پڑا۔ خصوصاً دو چھوٹے بھائیوں کا جو کہ اس وقت نوجوان اور غیر شادی شدہ تھے۔ ان معاشرتی رواجوں کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں 1957 میں سرگودھا چھوڑ کر اپنے گاؤں آکر تمام عزیز و اقارب کے ساتھ مل کر رہنا پڑا۔ مجھے 1957 کی نقل مکانی کی کوئی تفصیل تو یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ ہم ایک گھلے ٹرک میں بیٹھ کر اپنے گاؤں پہنچے تھے۔

گاؤں والے میرے والد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر گاؤں والوں کے روزمرہ کے مسائل یا مشکلات سُنتے تو وہ تمام انکے سامنے زمین پر زانوئے ادب طے کر کے بیٹھ جاتے اور خوف اور ادب کی وجہ سے بہت دبی آواز میں گفتگو کرتے۔ میرے والد کی شخصیت ڈرانے دھمکانے والی نہ تھی بلکہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ لوگوں کا احترام حاصل کرتے تھے۔

1957 میں میں پانچ سال کا تھا جب میں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک پرائمری اسکول میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ وہ اسکول گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھا جو کہ ہر روز مجھے پیدل طے کرنا پڑتا۔ شہر سے آنے والے ایک چھوٹی عمر کے لڑکے کے لیے جس کی والدہ بڑے پیار سے صبح کا ناشتہ تیار کر کے دیا کرتی تھی اور ہلکا سا دوپہر کا کھانا بھی بنا کر دیتی، یہ نئی طرز زندگی بالکل مختلف تھی اور اس تبدیلی کا مجھ پر ایک ناگوار منفی اثر تھا۔ ہر روز صبح کے ناشتہ کے لیے گندم کے آٹے اور مکھن سے پکی ہوئی ایک روٹی ملتی تھی، جس کو شکر یا گھریلو شہد اور اچار کے ساتھ کھانے کے بعد پیدل سکول چلا جاتا۔ میں ان تمام باتوں سے متنفر تھا مگر کسی سے شکایت بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ میں ایک بچہ ہی تو تھا۔ البتہ ہفتہ اتوار کی چھٹی کے دنوں میں اس مصیبت سے عارضی رہائی مل جایا کرتی تھی اور ہمیں گوشت کھانا نصیب ہوتا۔ باقی دنوں اکثر سبزیوں پر ہی گزارہ ہوتا۔

بعد میں میرے والد نے مجھے گاؤں کے ایک مڈل سکول میں داخل کیا جو کہ پہلے

اسکول سے بھی دور تھا، تقریباً 2 میل دُور۔ میرے پاس کپڑے کا ایک بستہ ہوتا جسے میں اپنے کندھے پر لٹکا لیا کرتا تھا۔ اور اس میں میں ایک نوٹ بک، چند پینسلین اور اپنا دوپہر کا کھانا رکھا کرتا تھا۔ اسکول کی ایک مخصوص یونیفارم تھی۔ گرمیوں میں خاکی رنگ کی شلو اور قمیض پہننا پڑتی تھی۔ ہاں البتہ سردیوں میں ہم اپنے گرم کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ اسکول جاتے ہوئے مجھے کھیتوں کے درمیان غیر آباد تنگ اور کچے راستوں سے گزرنا پڑتا اور پہلے ہی سے سمجھا دیا گیا تھا کہ کسی اجنبی سے بات نہیں کرنی۔ میرے دل میں سب سے زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ کوئی مجھے اغوا کر کے نہ لے بھاگے اور کسی دُور دراز علاقہ میں لے جا کر محنت مزدوری پر لگا دے۔

اُن دنوں یہ عمومی طور پر مشہور تھا کہ بعض قبیلوں کے لوگ بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں، پھر اُن کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنا بیج بنا دیتے ہیں اور اُن کو بھکاری بنا کر پیسے جمع کرتے ہیں۔ نہیں تو اُن سے کوئی اور غلامانہ محنت مُشقت کرواتے ہیں۔ گرد آلود کچی سڑکوں پر پیدل اسکول جانے میں پینتالیس منٹ سے ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ صبح کی اسمبلی کے لیے اسکول میں ایک اونچی آواز کی گھنٹی بجائی جاتی اور روزانہ ہم سب لڑکے مل کر پاکستان کا قومی ترانہ گاتے۔ اُس اسکول میں تمام مضامین اُردو میں پڑھائے جاتے جو کہ پاکستان کی قومی زبان تھی۔ ہر کلاس میں تقریباً چالیس سے پچاس تک کی تعداد میں طلباء ہوتے۔ ہم سارا دن فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھتے۔ البتہ دوپہر کو ایک گھنٹہ کی آدھی چھٹی ہوتی جس میں ہم دوپہر کا کھانا کھاتے اور آپس میں گپ بازی اور کھیل کود کر

لیتے۔ مجھے جو کلاس سب سے زیادہ پسند تھی وہ جسمانی ورزش کی تھی جسے PT کلاس کہا جاتا تھا۔

اُن دنوں ہمارے دلوں میں انگریزوں کے خلاف ایک ہمہ گیر نفرت موجزن تھی۔ تمام طلباء آپس میں پنجابی میں بات چیت کرتے تھے جو کہ اُردو سے ایک بالکل الگ زبان ہے۔ انگریزوں کے خلاف شدید جذبات ہونے کی بنا پر اگر کوئی انگریزی زبان میں بات کرتا تو اُس کو فرنگی (یعنی یورپ کا باشندہ) کہا جاتا۔ اسکول میں اسلامی تعلیمات پر کافی زیادہ زور دیا جاتا تھا اور بہت زیادہ اسباق کو زبانی یاد کرنا پڑتا تھا۔

میرے لیے مڈل اسکول و بال جان بن گیا تھا۔ کیونکہ وہاں غنڈہ گرد لڑکے اکثر مجھ پر دھونس جماتے تھے۔ مجھے تنگ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اسکول میں اچھی صاف ستھری پوشاک پہن کر جاتا، میں ایسے جوتے پہنتا تھا جو دوسرے طلباء کی نسبت اچھے اور قیمتی ہوتے۔ دوسرے لڑکے عام طور پر یا تو ننگے پاؤں ہوتے یا بالکل ارزاں جوتے یا سینڈل پہن کر آتے تھے۔ کیونکہ اُن میں اکثر غریب اور اُن پڑھ گھرانوں سے آتے تھے۔ وہ سب لڑکے میرے گرد گھیرا ڈال لیتے اور مجھے 'شہری بابو' کہہ کر پکارتے۔ میری والدہ میرے والد کے ساتھ اُن کی ایئر فورس میں ملازمت کے دوران بڑے شہروں میں رہ چکیں تھیں اور وہ مجھے گاؤں میں اس طرح پال رہی تھیں کہ جیسے میں کسی بڑے شہر میں رہ رہا ہوں۔ حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی اور ہم اب ایک دُور دراز گاؤں میں تھے جہاں بنیادی ضروریات کے سامان تک بھی مہیا نہ تھے۔ یہ

میری بدقسمتی تھی مگر میری والدہ گاؤں کے طور طریقوں اور اسکول میں ہونے والی غنڈہ گردی سے قطعاً واقف تھیں۔

میری والدہ نے یہ بات بھی لازم قرار دے رکھی تھی کہ اُن کے تمام بچے اُردو سیکھیں اور اُردو بولیں۔ گھر میں اور گھر سے باہر بھی۔ اسی لیے اسکول میں اُردو بولنے کی وجہ سے میرا مذاق اڑایا جاتا اور طرح طرح کی دھونس دی جاتیں کیونکہ میرے تمام ہم جماعتی لڑکے صرف پنجابی بولتے تھے اور اُن کے خیال میں میں ایک اونچی سوسائٹی کا فرد تھا اور اُردو بول کر میں اپنی شان دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔

اسکول کے لڑکوں میں سب سے بڑے غنڈے کا نام شفیق تھا۔ جسمانی طور پر دبلا پتلا تھا اور کسی دوسرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ اچانک میرا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا، دھکے مارنا شروع کر دیتا اور اکثر اوقات خوفزدہ کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے ڈراؤنی کہانیاں سناتا، دھمکیاں دیتا اور ذہنی طور پر مجھے پریشان کر دیتا۔ جس کے نتیجے میں میں صبح اٹھ کر اسکول جانے سے متنفر ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن اسکول جانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا، کیونکہ نہ کوئی میری سنتا اور نہ میری شکایت اور تکلیف کا مداوا کرتا۔ ایک دن مجھے شفق سے اسکول کے قریب ایک جگہ جانے کے لیے راستہ پوچھنا پڑا تو اس نے قصداً مجھے غلط راستے پر ڈال دیا، جس کے نتیجے میں میں کچی سڑکوں پر بڑی طرح کھو گیا اور ادھر ادھر سرگرداں پھرتا رہا۔ وہ دن مجھے سب سے زیادہ خوفزدہ کرنے والا تھا اور اس کی ہولناک یاد ابھی تک میرے ذہن پر مسلط رہتی ہے۔

کلاس میں شفیق دوسرے غنڈہ لڑکوں کو مجھے تنگ کرنے پر ابھارتا تھا اور وہ سب مل کر مجھے تیز دھار پینسل یا قلمیں چھو یا کرتے تھے۔ اور جب میں پوچھتا کہ مجھے کون پینسل چھو رہا ہے تو میرے پیچھے چھپا بیٹھا شفیق اور اس کا ٹولہ جواب میں کہتا:

”شہری بابو! ہم میں سے تو کوئی بھی نہیں چھو رہا۔“

اور یہ کہتے ہی مجھے کوئی پیچھے سے چھوتا اور سب ہنسنا شروع کر دیتے۔ بعض دفعہ وہ میرے کھانے کے ڈبے کو چھپا لیتے، یا مجھے گندے طریقے سے چھوتے اور جب کوئی بڑا قریب نہ ہوتا تو مجھے تنگ کرتے۔ اُن کی یہ غنڈا گردی میری اتنی چھوٹی اور اثر پذیر عمر کے دوران واقع ہوئی تھی کہ بڑے ہونے کے بعد بھی اس کے بد اثرات کے داغ میرے دل و دماغ پر قائم ہیں، اور آج تک مجھے رات کے وقت اکیلا رہنے میں خوف آتا ہے۔

ہاں البتہ میری زندگی میں اس ضرر رساں اور منفی آزمائش کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ اسکول کے لڑکوں کی مجھ سے غنڈہ گردی کرنے نے مجھے قوی دل بھی بنا دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں درپیش مشکل حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور اپنی راہ میں مستحکم رہنا میرا طریق بن گیا ہے۔ گھر میں تو کسی کو بھی میری باتیں سُننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ اسکول میں میری کیا قابلِ رحم حالت تھی۔ اس کے برخلاف میرا بڑا بھائی عزیز سرگودھا شہر میں جہاں پہلے ہمارے والد متعین تھے، ایک ممتاز بورڈنگ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہ چھٹیوں میں صرف چند دنوں کے لیے گاؤں آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے جرأت کر کے اپنے والد کو بتا دیا کہ اسکول میں میرے ساتھ غنڈہ گردی ہوتی

ہے۔ انہوں نے سُن کر جواباً کہا:

”اس کی کچھ پرواہ نہ کرو، اسکول میں ایسی احمقانہ باتیں تو عام طور پر

ہوتی رہتی ہیں۔ اسے ایک بڑا مسئلہ نہ بناؤ۔“

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اپنی والدہ سے اس کا ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ وہ کبھی کسی اسکول میں نہ پڑھی تھیں اور ایک پاکستانی عورت کی حیثیت سے میری تکلیف دہ حالت کو بدلنے میں کسی طور سے مددگار ثابت نہ ہو سکتی تھیں۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے اسکول میں میری زندگی پریشان سے پریشان تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بد مزاج غنڈہ لڑکا مجھے ہر روز ادھر ادھر دھکے دینا شروع ہو گیا، جس سے میں جسمانی تکلیف محسوس کرتا۔ آخر تنگ آ کر ایک دن میں نے اپنے ایک استاد سے شکایت کر دی۔ استاد نے میری شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ:

”اسکول کی مروجہ اصطلاح کی رُو سے غنڈہ گردی اس وقت متصور ہوتی

ہے جب کسی کو بُری طرح مارا پیٹا جائے، مثلاً کسی کے دانت ٹوٹ

جائیں اور جسم پر زخموں کے نشان پڑے ہوں۔“

اس طرح گاؤں کی زندگی میرے لیے بہت ہی پریشانی اور شرمساری میں

اضافے کا باعث بنتی جا رہی تھی اور میں خود کو تنہا پاتا تھا۔

بچپن میں مجھے صبح ناشتہ کرنے کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ ایک دن کئی دفعہ کوشش

کرنے کے بعد کہ میں ناشتہ کر لوں، والدہ نے میرے والد کو میری شکایت لگا دی کہ میں

اُن کی بات نہیں مان رہا۔ والد نے مجھے سزا دینے کا ایک انوکھا طریقہ نکالا۔
 صبح کے آٹھ بجے تھے اور میں اپنے دوستوں کے ہمراہ اسکول کی طرف جا رہا تھا کہ
 اچانک میں نے دیکھا کہ میرے والد سائیکل پر سوار میری جانب آرہے ہیں۔ یہ
 میرے لیے حیران کن بات تھی کیونکہ اس سے قبل کبھی بھی میں نے اپنے والد کو اتنی صبح
 سائیکل چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے میرے قریب آ کر بڑی اونچی آواز میں سب
 کے سامنے مجھے ناشتہ نہ کرنے پر ڈانٹ پلائی۔ انہوں نے چیخ کر مجھے کہا کہ گھر واپس
 جاؤں اور اسکول جانے سے پہلے ناشتہ کروں! سزا کے طور پر مجھے کچی سڑک پر اپنی
 سائیکل سے آگے آگے دوڑایا اور اس وقت تک دوڑایا جب تک گھر نہ آ گیا۔ اور یہ واقعہ
 اُس وقت ہوا جبکہ بہت سے طلباء اسکول کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ اور میں ان کے
 برخلاف اپنے والد کی سائیکل کے آگے واپس گھر کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میرے تمام
 دوستوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور مجھے سخت شرمندگی اُٹھانی پڑی۔
 مجھے معلوم تھا کہ میرے والد مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن پاکستانی کلچر میں باپ کا
 اپنے بچوں کے ساتھ پیار یا دوستی کے اظہار کا رواج نہ تھا۔ اسی لیے انہوں نے کبھی
 میرے بچپن بلکہ میرے جوان ہونے کے بعد بھی پیار و محبت کا اظہار نہ کیا۔ وہاں عام
 طور پر باپ اپنے بیٹوں کو نہ گلے لگاتا ہے نہ پیار کرتا ہے۔ میرے والد یوں تو ہونے کو
 موجود تھے مگر جذباتی طور پر میری زندگی میں شامل حال نہ تھے۔ اپنے باپ کے
 ہاتھوں یہ پہلی سب سے بڑی شرمندگی تھی جو مجھے اٹھانا پڑی جس کا ایک گہرا داغ میرے

ذہن پر ہمیشہ کیلئے نقش ہو گیا۔

میرے علم میں یہ بات بھی آئی کہ پاکستان میں لوگوں کے سامنے کسی کو بے عزت کرنا عام بات تھی اور اس حرکت کے دُور رس منفی اثرات کی کسی کو پرواہ نہ تھی۔ میرے والد چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوکروں کی پٹائی کر دیا کرتے تھے اور اُن بیچاروں کے پاس بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ دوسرے لڑکوں کے سامنے اپنی سائیکل کے آگے بھگانے کے واقعہ پر مجھے سخت شرمندگی اور کمتری کا احساس ہوا۔

کئی سالوں بعد اس واقعہ کے بارہ میں جب میں نے اپنے والد سے دریافت کیا تو انہوں نے جواباً کہا کہ وہ پاکستان میں رائج طرزِ زندگی کے مطابق اُس پر عمل کر رہے تھے۔ رائج الوقت طرزِ زندگی کا یہ انداز نہ مجھے اُس وقت سمجھ آتا تھا اور نہ ہی اب آتا ہے۔

میں اپنی والدہ کے زیادہ قریب تھا کیونکہ جب مجھے اپنے والد سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑتی تو بعض اوقات وہ میرے اور والد کے درمیان ثالث کا کام کرتیں۔ میری والدہ محبت کا اظہار کرنے والی اور اپنے بچوں کے جذبات کا بہت خیال رکھنے والی تھیں۔ انہوں نے خود کو کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لیکن وہ مجھے تعلیم دلوانے میں خاصی دلچسپی لیتی تھیں۔ حالانکہ اُن کو کچھ بھی معلوم نہ تھا تعلیم کیسے حاصل کی جاتی ہے اور نہ ہی تعلیم دلوانے کے سلسلہ میں انہیں کوئی اختیار حاصل تھا کیونکہ تعلیم سے متعلقہ تمام فیصلے وہاں مرد حضرات کیا کرتے تھے۔

میرے والد، میرے بڑے بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے لیکن مجھ کو کسی اچھے معیاری اسکول میں بھیجنے میں اُن کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں تو بڑی عجیب لگتی ہے، مگر اُن دنوں پاکستانی دیہاتی تہذیب کا یہ ایک عمومی پہلو تھا۔

علاوہ ازیں جب میرا بڑا بھائی عزیز گھر پر ہوتا تو میری والدہ جتنا کہ میرا خیال رکھتیں، مقابلتاً اُس سے بہت زیادہ اُس کا خیال رکھتیں۔ لیکن جب وہ واپس سرگودھا چلا جاتا تو پھر وہ میری مکمل نگہبانی کرتیں اور اگر کوئی میرے خلاف بات کرتا تو فوراً اُس کے مقابل آجایا کرتی تھیں۔ بہر حال مجموعی طور پر میری والدہ گھر میں میرے والد کی ایک خادمہ کی طرح کام کیا کرتی تھیں اور یہی اُس وقت کا تہذیب تھا۔

سرگودھا میں شہری زندگی کے تعلق سے مجھے بہت کم باتیں یاد ہیں اور یہ بھی یاد نہیں کہ شہری زندگی کو خیر باد کہہ کر ہم ساہیوال کے قریب کچی سڑکوں والے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آکر کیوں آباد ہو گئے تھے۔ ہم سب سرگودھا میں ایک مہذب ماحول میں زندگی گزار رہے تھے اور گاؤں میں آکر آباد ہونا میرے والد کے سوا ہم سب کے لیے ایک صدمہ تھا۔ یہاں بچے ننگے دھڑتے نظر آتے تھے اور دیہاتی بھی کم کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ اور مکا بازی، لڑائی مار کٹائی عام تھی۔ اپنے والدین کی شادی کے بعد کی لی ہوئی تصاویر سے نظر آتا تھا کہ اُن کو ادھر ادھر جانے اور سیر تماشے کا کافی شوق تھا۔ لیکن گاؤں میں آکر آباد ہونے سے جو تجربہ ہوا وہ اس سے یکسر مختلف تھا۔

ہمارے چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے لوگ اکثر آرائیں قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ ایک زراعت پیشہ ذات تھی۔ اُن کی اکثریت پنجاب میں آکر آباد ہو گئی تھی اور روایتی طور پر وہ لوگ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ اُن میں سے بعض لوگوں کے پاس تھوڑی تھوڑی زمینیں تھیں اور چھوٹے موٹے کاروبار بھی کرتے تھے۔ ہمارے گرد و نواح میں جو دوسری ذاتیں آباد تھیں اُن میں ملک، مرزا، جٹ، شیخ اور چوہدری شامل تھے اور ہر ایک ذات جدا گانہ طور پر کسی ایک مخصوص کام یا طرز زندگی کے لیے مشہور تھی۔

آرائیں ایک چُست و چالاک قبیلہ تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گاؤں کے آرائیں قبیلہ کے بعض لوگوں نے باہمی ساز باز کر کے میرے والد کے بھائیوں کے خلاف سازش کی کہ میرے والد ایئر فورس کی مستحکم ملازمت سے مستعفی ہو کر اُس دُور دراز گاؤں آکر اُسکے لمبردار کے طور پر یہاں کی دیہاتی زندگی گزاریں۔ اس واقعہ نے ہمارے گھرانے کی طرز زندگی کو مکمل طور پر بدل کے رکھ دیا۔ لیکن مجھے اس واقعہ کے پس منظر و جوہات کا بہت بعد میں جا کر علم ہوا۔

جب میرے والد گاؤں کے لمبردار کی حیثیت سے یہاں آکر آباد ہو گئے تو انہوں نے کاشتکاری کی زمین میں ہل جوتنے کے لیے ایک ٹریکٹر خرید لیا جو کہ آج سے ساٹھ سال پہلے ایک انوکھا کام تھا۔ انہوں نے کھیتوں میں کھاد کے استعمال سے فصل کو تیزی سے اگانا شروع کیا اور اُن دنوں یہ فصل بڑھانے کا ایک جدید طریقہ سمجھا جاتا تھا۔

وقت آنے پر انہوں نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں یعنی میرے چچوں کی شادیوں کا بندوبست کیا۔ داؤد چچا کی شادی ایک خوبصورت خاتون سے ہوئی، میری چچی دلشاد ایک پڑھے لکھے گھرانے سے آئی تھی اور یہ ایک غلط فیصلہ ثابت ہوا اور بعد میں میرے والد اور ہمارے گھرانے کے لیے پریشانی کا باعث بن گیا۔ میں حیران تھا کہ داؤد نے جو کہ ایک غیر تعلیم یافتہ اور بد مزاج شخص تھا ایک پڑھی لکھی خوبصورت عورت سے کیسے شادی کر لی! دلشاد ایک شہری خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو کھلے دل والے پڑھے لکھے لوگ تھے اور یہ میرے چچا کی شخصیت کے بالکل برعکس تھا۔

میرے والد نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی اعجاز کی شادی ایک آرائیں خاتون سے کروانے کا بھی بندوبست کیا۔ ہماری چچی شیم ایک دیہاتی خاندان کی تیز زبان خاتون تھی اور اس شادی کے فوراً بعد ہی ہمارے گھرانے میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

میرے والد کے ایک اور چھوٹے بھائی بھی تھے جن کا نام ادیس تھا۔ چچا ادیس میرے والد کے بہت قریب تھے اور وہ کافی مزاحیہ طبیعت اور نرم دل واقع ہوئے تھے۔ چچا ادیس اکثر دوسرے دیہاتیوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں کی بہت اچھی طرح نقل اتارتے تھے اور سب کو ہنساتے تھے۔ میرے والد ان کی ہنسی مذاق کی محفل سے بہت لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

جیسے جیسے میرے والد اپنے بھائیوں کے گھر آباد کرتے جاتے ویسے ہی آرائیں

لوگوں نے ہمارے خاندان میں تفرقہ ڈالنا شروع کر دیا۔ انہوں نے میرے تینوں چچاؤں، داؤد، اعجاز اور ادریس کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا کہ وہ اپنے حصّہ کی زمینوں کی الگ ملکیت کا مطالبہ کریں اور میرے والد اُن زمینوں پر سے اپنا اختیار و تسلط ختم کر دیں اور اس طرح وہ تینوں بھائی زیادہ دولت مند ہو جائیں گے۔

اُن کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ میرے والد نے اُن تمام زمینوں میں ہل چلانے کے لیے ٹریکٹر کیوں خرید رکھا ہے۔ انہوں نے میرے چچا داؤد کو ورغلا یا کہ وہ ٹریکٹر کے تیل کے ٹینک میں بہت ساری چینی ڈال دے اور اس طرح ٹریکٹر کا انجن کام کرنا بند کر دے گا اور تباہ ہو جائے گا۔ گاؤں والوں میں مشہور قصوں کے مطابق داؤد نے یہ کوشش تو کی تھی مگر ناکام رہا۔

آرائیں لوگ اپنی شرارت میں کامیاب رہے اور انہوں نے میرے تینوں چچاؤں کے دل و دماغ کو خوف، لالچ اور حسد سے بھر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ افواہیں بھی پھیلائی شروع کر دیں کہ میرا والد سخت لالچی اور طاقت کا بھوکا انسان ہے اور وہ کبھی بھی اُن زمینوں پر سے اپنا ذاتی قبضہ نہ چھوڑے گا اور اپنے خاندان کے لوگوں کو نقصان پہنچائے گا۔ ان افواہوں میں درحقیقت کچھ بھی صداقت نہ تھی، مگر پھر بھی آہستہ آہستہ ہماری خاندانی زندگی میں ایک گہری تبدیلی لانے کا باعث بنتی گئیں۔

ایک دن عید الفطر کی خوشیوں کے روز ہمارا سارا خاندان گاؤں کی مسجد میں نماز عید ادا کرنے اور ایک دوسرے کو مبارکباد کہنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا۔ خاندان کے ہر ایک فرد

نے صاف ستھرے کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے جو کہ عید کی خوشی کے دن عمومی طور پر پہنے جاتے ہیں۔ میرے والد عمر میں سب سے بڑے ہونے کی بنا پر عید کی نماز پڑھاتے اور مسجد کے اندر قبلہ رخ بنے ہوئے محراب میں کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔

سب لوگ جمع ہو چکے تھے اور نماز شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے اور میرے چچا عیسیٰ نے میرے والد کو کہا کہ بھائی جی! نماز پڑھا دیں! میرے والد اپنی جگہ سے اٹھے اور محراب کی جانب جانا شروع کیا کہ اچانک چچا اور یس نے بھی محراب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تا کہ عید کی نماز وہ پڑھائیں۔ میرے والد کے تینوں چھوٹے بھائیوں نے ایک جتھہ بنا لیا اور تقاضا شروع کر دیا کہ نماز وہ پڑھائیں گے۔ اُن کی یہ حرکت میرے والد کی سخت بے عزتی کے مترادف تھی کیونکہ خاندان کے قابل احترام بزرگ ہونے کی حیثیت کو لکا را گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہاں بڑے زور سے دنگا مُشتی شروع ہو گئی اور بڑھتے بڑھتے بھائیوں کے درمیان تشدد آمیز مکے بازی تک نوبت جا پہنچی۔ یہ لڑائی محراب کے قریب شروع ہوئی جو کہ مسجد کا سب سے مقدس مقام سمجھا جاتا ہے اور ہوتے ہوتے مسجد کے اندر اور باہر تمام حصوں تک پھیل گئی۔ میرے والد اور چچا عیسیٰ دونوں ایک طرف اور باقی تینوں چھوٹے بھائی اُن کے مقابلہ میں دوسری طرف تھے۔ اور تمام بھائی ایک دوسرے کو مکے اور لاتیں مارنے لگے۔

یہ نفرت بھری شدید مار کٹائی کئی منٹوں تک جاری رہی اور اس وقت ختم ہوئی جب

پانچوں بھائیوں کے سانس اُکھڑ گئے اور وہ سب زور آزمائی کرتے کرتے تھک گئے۔ اس لڑائی کے دوران میرے والد کی دھوتی تقریباً گرنے والی تھی اور اس وقت یہ جھگڑا ختم کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ بھائی عزیز اور میں حیران و پریشان یہ سب دیکھتے رہے کیونکہ ہم دونوں تماش بین تھے اور اس جھگڑے میں شامل نہ ہوئے تھے۔ باہمی لڑائی جھگڑا کرنا تو کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن وہ تو مسلمانوں کا ایک مقدس دن تھا اور پھر اُس سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ واقعہ ایک مسجد کے اندر ہوا جو کہ خدا کا گھر ہے اور مسجد کے اندر لڑنا جھگڑنا مسجد کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ اسلام میں مسجد ایک مقدس مقام تصور کی جاتی ہے اور عبادت گاہ میں مار پیٹ بہت ہی افسوسناک اور گھناؤنی بات تھی۔

انگریزوں کا صدیوں پُرانا آزمودہ نسخہ تھا کہ منقسم کرو اور حکومت کرو اور اس طرح وہ لوگوں میں باہمی جنگ کروا کر اُس ملک کو فتح کر لیا کرتے تھے۔ اسی چال سے آرائیں ہمارے خاندان کے باہمی اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

بھائیوں کے درمیان باہمی دوستی ختم ہو گئی اور سب کو چوٹیں آئی تھیں۔ چچا اعجاز اپنے سوچے ہوئے مُنہ اور خون بہتے ناک کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو پہلے تو عورتیں تماشین تھیں۔ لیکن چچا عیسیٰ کی بیوی ایک مضبوط دیہاتی عورت تھی جس کا جسم ایک پہلوان کی مانند تھا، وہ بھی لڑائی میں شامل ہو گئی اور میرے تینوں چچوں کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ ایک زمیندار گھرانے سے آئی اور گلی کوچوں کی لڑائی کے فن سے خوب واقف تھی۔ اس لڑائی کے پیچھے دولت و طاقت کی حرص اور خود

پرستی کے عناصر کا رفرما تھے اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ یہ لڑائی ایک مقدس جگہ اور عبادت گاہ میں ہوئی۔ ایک بچہ ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ بات بالکل سمجھ نہ آئی تھی کہ میرے گھر والے ایک پاکیزہ جگہ میں کیوں لڑ رہے تھے! مسجد تو ایک ایسی جائے پناہ ہے جہاں پولیس بھی داخل ہو کر کسی ایسے شخص کو گرفتار نہیں کرتی جس نے کوئی جرم کرنے کے بعد وہاں پناہ لی ہو۔

بعد میں اس واقعہ پر غور کرنے سے مجھے یہ قیمتی سبق حاصل ہوا کہ انسان کس قدر جلد حرص، حسد اور طاقت حاصل کرنے کے نشہ کے زیر اثر آ سکتا ہے اور ان منفی رجحانات کا شکار بن جاتا ہے۔ اس طرح آرائیں لوگ میرے چچوں کی سوچ بدلنے میں کامیاب ہو گئے اور ہمارے خاندان میں ایک گہری پھوٹ ڈلوادی۔ اُس وقت قطعاً مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ چند تشدد آمیز لمحات ہمارے گھرانے کے مستقبل کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیں گے۔ اب اُن واقعات پر نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہیں جن کی بناء پر میری زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ اُس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کس طرح ایک واقعہ آنے والے واقعات کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ اُس واقعہ نے میرے لیے اور میرے خاندان کے لیے زندگی کا ایک نیا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا اور ہمیں ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔

اُس وقت ہمارے گھرانے میں بہت زیادہ اثر رسوخ رکھنے والی ہماری دادی ”بے جی“ تھیں۔ اُس لڑائی کے بعد وہ میرے تینوں چچوں کی طرفدار بن گئیں اور

انہوں نے میرے والد کی کھلم کھلا بے عزتی کرنا شروع کر دی۔ گاؤں میں تو وہ پہلے ہی سے ایک دہشتناک عورت کے طور پر مشہور تھیں۔ جب وہ گاؤں کی گلیوں میں چلتیں تو لوگ ادھر ادھر چھپنا شروع ہو جاتے کیونکہ وہ ان کے غصے سے بہت ہی زیادہ خائف تھے۔ لڑائی کے بعد بے جی ہمارے گھر کے بڑے دروازے کے باہر آکھڑی ہوئیں اور میرے والد کو ”سقو.. سقو“ کہہ کر بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ (سقو۔ اسحاق نام کا مخفف تھا)

”سقو! تیرے پاس کچھ نہیں ہے۔ نکل جاؤ یہاں سے! تم مرجاؤ گے اور

جہنم میں جاؤ گے۔ تم بالکل خالی ہاتھ جاؤ گے! تم ختم ہو چکے ہو!“

اس کے علاوہ بے جی بڑی گزرگاہ سے ہٹ کر گاؤں کی کچی سڑکوں پر کھڑی ہو کر میرے والد کو گالیاں نکالتی اور بُرا بھلا کہتی اور اُن پر ظلم کرنے اور لڑائی شروع کروانے کا الزام لگاتی تھیں۔ اُن دنوں بے جی میرے والد سے سخت نفرت کا اظہار کر رہی تھیں اور اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے یحییٰ سے انتہائی زیادہ پیار جتاتی تھیں۔

بے جی ایک مضبوط اور آزاد طبع عورت تھیں۔ لوگوں کے خیال میں وہ دہشتناک اور غصے سے بھرپور تھیں لیکن انہوں نے ایک لمبی عمر پائی اور ایک سو پانچ سال تک زندہ رہیں۔ زندگی کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اُن کی زندگی کے آخری پندرہ سالوں میں صرف میرے والد ہی نے اُن کا خیال رکھا۔ اپنے گھر میں انہیں ہر قسم کا آرام مہیا کیا اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ میرے والد نے کبھی بھی انکے خلاف کوئی بات نہیں کی حتیٰ کہ

جب وہ اُن کے خلاف زبان درازی کیا کرتی تھیں اُس وقت بھی وہ بالکل خاموش رہتے۔ میں نے زندگی میں اپنے والد سے یہ ایک بہت اہم سبق سیکھا کہ ہمیشہ ہی صحیح کام کرنا چاہیے جبکہ صحیح کام کرنا کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو۔

یہ بات بھی واضح تھی کہ بے جی کا گلی کوچوں میں نکل کر بدزبانی اور غصے کا اظہار کرنا میرے والد کے لیے ایک انتہائی تکلیف دہ امر تھا۔ 1962 میں جبکہ اُن کے پاس بہت کم رقم تھی، انہوں نے ہم سب کو اُس گاؤں سے نکال کر ساہیوال شہر میں فریڈ ٹاؤن نامی ایک قصبہ میں آباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت میری عمر دس سال تھی۔ فریڈ ٹاؤن ہمارے گاؤں سے تقریباً پانچ میل دُور تھا۔ وہاں ایک مقامی درزی سے ہم نے ایک معمولی سا مکان چالیس روپے ماہانہ کرایہ پر لے لیا۔ میں اُسی کرایہ کے مکان میں اکیس سال کی عمر تک رہا اور پھر 1973 میں پاکستان چھوڑ کر کینیڈا آ کر آباد ہو گیا۔ فریڈ ٹاؤن آ کر آباد ہونے سے ہمارے مقدر میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہو گئی اور ہمارے خاندان کے لیے مستقبل کی ترقیات کے دروازے کھل گئے۔

اگر عید کے دن وہ لڑائی نہ ہوئی ہوتی تو اغلباً آج بھی میں اُسی گاؤں کے گرد آلود راستوں پر چل رہا ہوتا۔ اپنے دادا کی زمینوں پر ہل جوت رہا ہوتا، بھینسوں کا دودھ دوہ رہا ہوتا اور مرغیوں کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا۔ اور کبھی بھی سمندر پار کر کے کینیڈا اور امریکہ میں ایک نئی اور بہتر زندگی کا آغاز نہ کر سکتا۔ اکثر اوقات ہماری زندگی کے بعض انتہائی غمگین گُن اور افراتفری سے بھرپور لحات، ہماری بہتری اور خوش نصیبی کا پیش خیمہ بن

جاتے ہیں۔ زندگی کے ایسے واقعات سے میں نے جو سبق حاصل کیا وہ یہ ہے کہ مشکلات کے زمانہ میں کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور سکونِ قلب کے ساتھ شکرگزاری اور مثبت سوچ کو قائم رکھنا چاہیے۔ کیونکہ ہم کو کچھ خبر نہیں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے اور مستقبل میں ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے ارادوں پر کامل ایمان ہے اور اُسی کے علم میں ہے کہ کس امر میں ہمارے لیے بہتری مضمَر ہے۔

ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم خدا پر پورا بھروسہ کریں اور اپنی سوچوں کو ہمیشہ مثبت رکھیں، بہ نسبت اس کے کہ جو امور ہماری دسترس سے باہر ہیں اُن کو قابو میں لانے کی کوشش میں لگے رہیں۔ میرے دادا کو اپنی زمین سے محبت تھی اور اسی طرح میرے والد اور والدہ کو بھی۔ اُن کے لیے یہ صرف زمین ہی نہ تھی بلکہ اُن کی عزت، وقار، میراث اور رُتبہ سب اُس زمین کے ساتھ وابستہ تھے اور زمین کے کسی ٹکڑے کو بیچنا خاندان کی اور آئندہ آنے والی نسلوں کی بے عزتی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس لیے میرے والد تمام عمر بہت سی قیمتی زمینوں کے مالک رہے، لیکن نقد رقم سے ہمیشہ تہی دست رہے اور کبھی بھی اپنی زمین کو بیچنے کا نہ سوچا۔ بد قسمتی سے میرے والد کی کروڑوں روپے کی قیمتی زمین چوری اور دھوکہ دہی سے ہتھیالی گئی۔

میرے والد کی وفات کے بعد اُن کے بھائی اعجاز نے مقامی اہلکاروں اور ججوں کو رشوت دے کر اور دباؤ ڈلو کر، جھوٹی شہادت، دروغ حلفی اور جعلی دستخطوں والی دستاویز کے ذریعے میرے والد کی زمین کا تبادلہ اپنے نام کروالیا۔ اپنے والد کی زمینوں کا قبضہ

واپس لینے کے لیے ہم نے کبھی بھی عدالتوں کا رخ نہیں کیا، کیونکہ ہم لمبی مقدمہ بازی اور اپنے بڑے خاندان میں رنجش بڑھانے کے حامی نہ تھے۔ حالانکہ جو کچھ بھی ہوا وہ باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش سے ہوا تھا اور دھوکہ دہی، مکاری اور غیر قانونی طور سے ہمارے اپنے چچائیگی نے ہماری زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا، جس میں قدرے چچا داؤد کا بھی ہاتھ تھا۔ اس کتاب لکھنے کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ 2016 میں چچا داؤد کی وفات کے بعد چچائیگی اور اُس کے بیٹوں نے چچا داؤد کی اُس زمین پر قبضہ کرنے کی بھی سازش کی تھی جو کہ اُس نے ہمارے والد کی وفات پر ہماری زمین میں سے لے لی تھی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی، کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔

بہر حال جو بھی ہمارے خاندان کے افراد نے غلط اور غیر قانونی کام کئے اُن کی وجوہات خود اُن کو ہی معلوم ہوں گی۔ میرے دل میں اُن کے خلاف قانونی اقدامات اٹھانے کا قطعاً کوئی خیال نہیں۔ اپنے پھیلے ہوئے بڑے خاندان کی خیر سگالی کے لیے میری دعائیں اُن سب کے ساتھ ہیں۔ اپنے چچاؤں اور ان کی اولادوں اور ان کے گھرانوں کے خلاف میرے دل میں کوئی پوشیدہ کینہ، بغض اور تلخی نہیں ہے۔ میں اپنے حقوق اور خوش قسمتی کا صرف طاقتِ بالا سے طلبگار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ میرا مددگار رہے۔ آمین!



لڑکپن سے جوانی تک

گرد آلود راستوں کے گاؤں سے فرید ٹاؤن آکر آباد ہو جانے کی خوشی اگرچہ کسی چھوٹے سے قصبہ سے نکل کر ٹکسار اور پھر نیویارک منتقل ہونے کے مترادف تو نہیں، لیکن پھر بھی یہ نقل مکانی میرے لیے بہت ہی مُسرّت کا باعث بنی اور مجھے فرید ٹاؤن آکر رہنا بہت ہی پسند آیا۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں طرح طرح کی سرگرمیاں تھیں۔ اس کی سڑکوں پر گڑھے تو تھے مگر پھر بھی تمام سڑکیں پختہ اور ہموار تھیں اور گاؤں کے کچھڑ بھرے گرد آلود راستوں کے بالمقابل میرے لیے یہ ایک بہت خوشکن بات تھی۔

ہمارے گھر سے صرف پانچ منٹ دور ایک مارکیٹ تھی جس میں بہت ساری دکانیں تھیں۔ وہاں سب سے بڑی دکان ایک جنرل مرچنٹ سٹور تھا جس میں ہر چیز کہ جیسا آپ تصور کر سکیں مل جاتی تھی۔ اُس مارکٹ کے چوراہے میں نان، بانیسیکل، گوشت، مٹھائی اور مشروبات کی دکانیں تھیں اور تین کلینکس ڈاکٹروں کے بھی موجود تھے۔ خاص طور پر بانیسیکلوں کی مرمت کی دکانوں سے تو تمام قصبہ بھرا پڑا تھا کیونکہ اُن دنوں نقل و حمل کا سب سے بڑا ذریعہ بانیسیکل ہی تھی۔ بہر حال، یہ تمام سہولتیں میرے لیے بڑی خوشی کا باعث بنیں۔

ایک دیہات کے چھوٹے سے گاؤں کی نسبت کہ جہاں سے میں آیا تھا اس قصبہ کے لوگ بہت ہی نیک فطرت، نرم دل اور ملنسار تھے اور گلیاں پُر امن۔ وہاں کئی سینما گھر بھی تھے جہاں جا کر ہم فلمیں دیکھتے۔ تمام ہمسایوں کے باہمی تعلقات دوستانہ تھے اور ہر شام میری والدہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر سیر کو نکل جاتیں۔

1960ء سے 1970ء کے درمیانی عرصہ میں تمام پاکستانی خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ شام کے وقت ہم سب لڑکے صاف ستھرے خوبصورت باغوں کی سیر کرنے کے لیے نکل جاتے جو کہ ایک نہر کے کنارے واقع تھے۔ اس کے علاوہ فریڈ ٹاؤن کے قریب ہی ملٹی (یا سمن) کے پھولوں سے مہکتا ہوا سا ہیواں گورنمنٹ کالج کا کیمپس تھا جو کہ ہوا خوری کے لیے بہت ہی عمدہ جگہ تھی۔ میں گلی ڈنڈا بھی کھیلتا جس میں لکڑی کی دو چھڑیاں، ایک بڑی اور ایک بالکل چھوٹی استعمال ہوتی تھیں۔ میں پتنگ بازی بھی کرتا۔ البتہ کرکٹ نہ کھیل سکا کیونکہ اُس کا گیند بٹا اور دوسری لوازمات کافی مہنگی تھیں اور اُن کو خریدنے کی مجھ میں استطاعت نہ تھی۔ اُس کے بدلے فٹ بال اور ہاکی کھیل لیا کرتا تھا جو کہ قدرے ارزاں کھیل تھے۔

کھانا ہم عام طور پر گھر میں ہی کھاتے لیکن جب کبھی باہر جانا ہوتا تو گلی کوچے کے دکانداروں سے خرید کر بھی کھا لیتے۔ وہ تیلہ مرغی فروخت کرتے تھے جو کہ مریچ مصالحے والا کافی مزیدار کھانا ہوتا۔ شام کو ہم گلی کے دکاندار کے پاس چلے جاتے اور اپنی پسند کی کوئی مرغی چُن لیتے جسے وہ ہمارے سامنے حلال کرتا اور پکا دیتا۔ لکڑیوں کی آگ پر بھنے

ہوئے پیاز ٹماٹر اور مرچ مصالحہ لگے تکے بہت ہی ہر دل عزیز خوراک تھی اور لوگ اُسکو خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ اکثر دکانوں میں بڑے بڑے تندور بھی لگے ہوئے تھے جن میں سے تازہ تازہ مکھن لگے گرم نان پک کر نکلتے تھے۔ عام طور پر لوگ سیون اپ یا کوکا کولا پیتے کیونکہ مصالحے دار کھانے کے ساتھ ٹھنڈا مشروب خوب مزہ دیتا۔

پیٹ بھر کے کھانے کے بعد بڑی عمر والے لوگ اکثر حُقہ پیتے۔ میرے والد کے پاس کوئی حُقہ نہ تھا کیونکہ اُن کو تمباکو نوشی سے سخت نفرت تھی اور نہ ہی میں نے یہ عادت پکڑی۔ ہاں البتہ میری دادی کے پاس ایک سجا ہوا خوبصورت حُقہ تھا اور اکثر وہ سارا دن بیٹھی حُقہ پیتی رہتی۔ خاص طور سے ناشتے، دوپہر اور رات کے کھانے کے بعد۔ اُن کا حُقہ بھرنے کے لیے ایک ملازم مقرر تھا۔ بہت ہی کم وہ اپنا حُقہ کسی اور کو استعمال کرنے کی اجازت دیتی۔ اُن ایام میں مردوزن اکٹھے بیٹھ کر حُقہ نہ پیتے تھے کیونکہ بہت سے اور کاموں کی طرح یہ بھی ایک ایسا کام تھا جس میں مذکر و مونث کی تمیز قائم رکھی جاتی تھی اور جنہیں مرد حضرات اور عورتیں باہم مل بیٹھ کر نہ کرتے تھے۔

سیاسی مشکلات کے باوجود پاکستان بحیثیت ملک ترقی پزیر تھا۔ 1960 کی دہائی میں وہاں سیاہ و سفید ٹیلیویشن آنا شروع ہو گئے تھے اور شام سات بجے سے رات دس بجے تک ٹیلیویشن پر پروگرام نشر ہوتے تھے۔ چونکہ ہمارے گھر میں کوئی ٹیلیویشن نہ تھا اس لیے ملکی اور قومی پروگرام سننے کے لیے ہمارا انحصار ایک ایسے ریڈیو پر تھا جو تمام ملک کے پروگرام نشر کرتا تھا۔ وہ ریڈیو ہمارے ایک ماموں نے انگلینڈ سے تحفہ کے طور

پر ہمیں لا کر دیا تھا۔

1962 میں جب ہم نے ساہیوال کے فریڈ ٹاؤن میں آ کر رہنا شروع کر دیا تو میرے والد نے مجھے ایک مقامی اسکول ننگل انبیا ہائی اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ یہ بھی ایک معمولی سا غیر سرکاری اسکول تھا جس کی انتظامیہ بے حد بے کار تھی۔ یہاں کافی سختی ہوتی۔ مگر سب سے زیادہ سخت خود ہمارے اساتذہ تھے نہ کہ میرے ساتھی طلباء۔ اگر کلاس میں کوئی تھوڑی سی بھی تاخیر سے پہنچتا یا استاد کا اپنا دن اچھا نہ گزر رہا ہوتا تو وہ ہمیں ہاتھ پھیلانے کا حکم دیتا اور ایک تیز چھڑی سے مارتا۔ وہ چھڑی جسے ڈنڈا بھی کہتے تھے بانس سے کاٹ کر یا کسی درخت کی خشک ٹہنی کو توڑ کر بنائی جاتی تھی۔ ڈنڈے سے ہاتھوں پر مارنے کا رواج عام تھا خصوصاً اُن اسکولوں میں جہاں انتظامیہ کمزور ہوتی اور اُستاد لڑکوں کو ڈرانے دھمکانے کا کام ڈنڈے سے لیتے تھے۔ اُستادوں کے پاس دو یا تین چھڑیاں ہوتی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ چھٹی کے دن اُن میں سے بعض اُستاد نئے چھڑی ڈنڈے بنا کر بہت خوش ہوتے کہ اسکول کھلنے پر وہ کم عمر لڑکوں پر اُن کا خوب اچھا استعمال کر سکیں گے۔

ہر تکلیف دہ سزا دینے کا ایک مخصوص طریق اور اتار چڑھاؤ بھی تھا۔ اگر آپ پر کسی غلطی کے مرتکب ہونے کا الزام لگتا تو سب سے پہلے آپ کو بالکل سیدھے کھڑے ہونے کو کہا جاتا۔ پھر اُستاد آپ کو اپنی ہتھیلیاں اچھی طرح پھیلانے کا حکم دیتا تا کہ اُسکی چھڑی کا وار آپ کی پانچوں انگلیوں پر پورے زور سے پڑے۔ اُستاد قریب ہی کھڑے

ہو کر چھڑی مارنا شروع کرتا اور اپنے وار گننا شروع کر دیتا۔ ایک.. دو.. تین... اور کوئی تعداد معین نہ تھی۔ آخر میں وہ اس قدر زور سے مارنا شروع کرتا کہ درد کے مارے طالب علموں کے آنسو بہنا شروع ہو جاتے۔ اسکول میں کوئی قاعدہ قانون تو تھا نہیں کہ ایک بے رحم استاد زیادہ سے زیادہ کتنی سزا دے سکتا تھا۔ اس طرح کم عمر لڑکوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کا یہ ایک بہت موثر طریق تھا۔ خصوصاً اُن اسکولوں میں جہاں کہ تعلیمی معیار کمزور تھا۔

میں اسکول کے اُس ظالمانہ تعلیمی ماحول میں پڑھ کر بڑا ہوا جہاں کے اساتذہ یہ سمجھتے تھے کہ جسمانی سزا دے کر کم عمر لڑکوں کو مستقبل کی زندگی میں غلطیاں سرزد کرنے سے بچایا جاسکتا تھا۔ اکثر اوقات وہ طالب علموں کو درد کے مارے روتا ہوا چھوڑ دیتے جو اپنی سوچی ہوئی ہتھیلیوں یا تکلیف کے مارے جسم کے دوسرے حصوں کے ساتھ کلاس کے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر کچھ دیر سسکتے رہتے۔ اور اگر اُنکے رونے کی آواز ذرا سی بھی بلند ہو جاتی تو اُس پر اُن کو اور مار پڑتی۔ چند بار مجھے بھی اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے ہاتھوں، جس کا نام مشتاق تھا، ڈنڈے پڑے۔ وہ ہیڈ ماسٹر بھی اپنی ہی نوعیت کا ایک دہشتناک انسان تھا۔ اُس کے سوا مجھے اپنی کلاس کے کسی استاد کے ہاتھوں مار کھانا یاد نہیں۔

میں اپنی ابتدائی تعلیم سے لے کر ہائی اسکول تک کے تعلیمی اداروں سے بد دل اور ناخوش رہا ہوں اور مجھے اپنے والد پر غصہ بھی آتا تھا کہ انہوں نے کیوں مجھے نچلے درجہ

کے کمزور اور بد انتظام اسکولوں میں پڑھائی کے لیے داخلہ دلوا دیا۔ پہلے تو گاؤں کے اسکول تھے اور پھر وہ بے کار ساہائی اسکول جو کہ فریڈ ٹاؤن کے قریب گورنمنٹ کالج کے پاس واقع تھا۔

اس دوران میرا بڑا بھائی عزیز مشہور و معروف پاکستانی ایئر فورس اسکول میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ عزیز کا حصولِ تعلیم کا تجربہ مجھ سے بالکل مختلف تھا جیسے کہ میں پہلے بھی اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ اُن دنوں پاکستانی کلچر میں یہ بات عام تھی کہ اکثر والدین اپنے چھوٹے بچوں کی بہ نسبت سب سے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور اُسکے مستقبل کی زندگی میں کامیابی کے بہترین مواقع مہیا کرنے کی پوری کوشش کیا کرتے تھے اور اگر کوئی لڑکی پیدا ہوتی تو رائج الوقت معاشرہ میں اُس کا کام بچے پیدا کرنا، کھانا پکانا، خدمت کرنا اور ایک اچھی خانہ دار عورت ہونا تھا۔ اور دیہاتی لڑکیوں کو تو اسکول میں تعلیم حاصل کرنے یا تحصیلِ معاش کے لیے کسی کام کاج کو سیکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

ان مروجہ روایتوں کے پیشِ نظر میں محسوس کرتا تھا کہ میرے والد میرے بھائی عزیز کے مقابل مجھے اعلیٰ تعلیم دلوانے کے حق میں نہ تھے۔ اُن دنوں گھر میں میری والدہ کی بھی کچھ زیادہ نہ سنی جاتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر میں اپنے بچپن کی زندگی کے روزمرہ کے مسائل، واقعات اور مشکلات کے متعلق کسی سے بھی بات نہ کر سکتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ غیر معیاری تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کی بنا پر میں

ایک کمزور طالب علم ہوں کیونکہ پڑھائی میں اونچا درجہ حاصل کرنے کے لیے میں بنیادی مہارت سے ناواقف تھا۔ مثال کے طور پر میری آٹھویں جماعت کے کیمسٹری کے استاد نے میری تعلیم کی آخری حد مڈل اسکول تک محدود رہنے پر مہر لگا دی اور اُس نے صاف صاف میرے منہ پر مجھے کہہ دیا:

”تمہارا کوئی مستقبل نہیں اور تم نہ ہونے کے برابر ہو۔“

اُس نے امتحان میں حاصل کردہ میرے نمبر جماعت کے سب سے بہترین طالب علم کے حاصل کردہ نمبروں کے بالمقابل رکھے جو کہ کلاس کا مانیٹر تھا اور اکثر مضامین میں نوے فیصد نمبر لیا کرتا تھا۔ مجھے اُس کی ان باتوں سے دُکھ تو پہنچا مگر میں نے کچھ زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ مجھے محکم یقین تھا کہ فقط تعلیمی کامیابیوں سے کسی شخص کا مستقبل نہیں بنا کرتا۔ لیکن اُس استاد نے ایک بات ایسی بھی کہہ دی جس سے مجھے سیاہ اندھیرے سمندر میں روشنی کی کرن نظر آنے لگی، اُس نے مجھے کہا کہ میں سمجھدار ہوں، عقل و فہم رکھتا ہوں اس لئے اگر میں محنت کروں تو کسی چھوٹے موٹے کام میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ تب سے مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کامیاب ہونے کا پُر جوش جذبہ قائم رکھنے کے لیے مستقل مزاجی، اُن تھک محنت اور خطرہ مول لینے کی ہمت کا ہونا ضروری ہے۔ اور میرا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ البتہ اس کی سچائی کا اظہار میری زندگی کے بعد میں آنے والے حالات میں ہوا۔ ایک نصیحت جو کہ ہمیشہ اپنے نئے ملازمین، ساتھی کارکنان اور خاندان کے افراد کو کرتا چلا آ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے عقل و فہم

اور جوش و جذبہ سے کام لینا ضروری ہے۔

اس دوران میرے والد نے مجھے حساب اور کیمسٹری پڑھانے کے لیے ایک علیحدہ اتالیق کا بندوبست بھی کیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے وہاں جانا پسند نہ تھا اور بعض اوقات میں اُس کی کلاس میں جانے کی بجائے کسی سینما گھر جا کر کوئی فلم دیکھ آتا۔ ایک دفعہ جب میں گھر واپس آیا تو میرے والد نے مجھ سے پوچھا کہ کلاس کیسے گئی تھی۔ میں نے سر ہلا کر جواب دیا کہ اچھی تھی۔ حالانکہ اُس دن میں اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا تھا جو کہ ہمارے ہاں مہمان آیا ہوا تھا اور میرے والد کو معلوم تھا کہ میں اپنے اتالیق کے پاس پڑھنے نہیں گیا اور وہ خود اتالیق کے گھر جا کر دیکھ آئے تھے کہ میں وہاں نہیں ہوں۔ اُس دن والد کے ہاتھوں میری خوب پٹائی ہوئی اور شاید وہی ایک سخت جسمانی سزا تھی جو کہ کبھی مجھے اپنے والد کے ہاتھوں کھانا پڑی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھریلو حالات کو نبھانے سے میرے والد نے گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس بات سے بھی غمزدہ تھے کہ ہم اُس معیار کی طرز زندگی نہ گزار سکتے تھے جس کی کہ اُن کو خواہش تھی۔ ہماری زمینوں سے جس قدر نقد رقم آتی اس سے گھریلو ضروریات پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ میرے والد گھر سے باہر کے معاملات میں زیادہ الجھے رہتے اور اُن کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اپنی زمینوں کی آمد کو بڑھانے کی کوشش کریں اور اپنے گھر کی مالی حالت کو بہتر کریں۔ اس کی بجائے وہ دوسرے لوگوں کے باہمی اختلافات سلجھانے میں مصروف رہتے اور لوگوں سے وعدہ کرتے کہ وہ انکو

کینیڈا بھیجنے میں مدد کریں گے کہ جہاں عزیز رہ رہا تھا۔
جن دنوں میرے والد اپنے گھریلو معاملات سے لائق ہوتے جا رہے تھے، وہ میری نوجوانی کے ایام تھے اور میرے دل میں نئی دلچسپیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔
فرید ٹاؤن میں اپنے ہمسایوں کی ایک لڑکی سے میری واقفیت ہو گئی۔ اُس کا نام مونا تھا۔ وہ میری چھوٹی بہن سیمہ کی ہم جماعتی تھی اور وہ دونوں آپس میں سہیلیاں تھیں مونا کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ اُس وقت میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور مونا مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔

میں کوئی بہت زیادہ تخلیقی قوتوں کا مالک تو تھا نہیں۔ لیکن پھر بھی میں اُس کے پڑھائی کے کاموں میں اُسکی مدد کرتا، نظمیں لکھتا اور پہیلیاں بناتا۔ اسی طرح مجھے اپنی ممانی کی بہن کی ایک بیٹی جس کا نام آنا تھا، اچھی لگتی تھی۔ اُس سے میری ملاقات سنگلہ ہل میں ہوئی جہاں کہ میرے دادا کا ایک مکان تھا اور ہم سب گرمی کی چھٹیاں گزارنے وہاں گئے تھے۔ سنگلہ ہل اسلام آباد سے 140 میل جنوب میں واقع ہے۔

ہماری دوستی دو گرمیوں تک رہی۔ پہلی گرمی کی چھٹیوں میں سب گھر والوں کے روزانہ اکٹھے ہونے کے دوران اور شام کی سیر کرتے ہوئے میری اور آنا کی واقفیت ہوئی اور دوسری گرمی میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ گرمیوں میں ہم نہر میں نہانے کے لیے جاتے تھے اور جن کو تیرنا نہ آتا تھا وہ ٹائر کی ہوا سے بھری ہوئی ٹیوب پکڑ کر نہر کے اندر اترتے تھے۔ دوسری گرمی میں نہاتے ہوئے آنا کے ہاتھ سے

ٹیوب پھسل گئی اور وہ نہر کے اندر ڈوبنے لگی۔

نہر کا پانی کافی گہرا تھا اور اسکا بہاؤ بھی تیز تھا۔ میں نے اُس کو ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا اور فوراً غوطا لگا کر اُسے پانی کی اوپری سطح پر لے آیا۔ گہرے پانی میں ڈوبنے کے خوف سے وہ میرے ساتھ چپٹی رہی تاوقتیکہ ہم دونوں نہر سے باہر نہ نکل آئے۔ ایک سخت خطرے میں سے اُس کی جان بچانے کے لیے میرے فوری ردِ عمل نے ہم دونوں کو اچھا دوست بنا دیا۔ آنا ایک موٹی سی، خوش طبیعت اور اچھی لڑکی تھی۔ اپنے اسکول کے دنوں میں میں نے اپنے ایک دوست کو ”اپنی مدد آپ“ کے تعلق سے ایک مقولہ سنایا جب کہ وہ کسی تعلیمی مضمون کے ایک مشکل کام سے نبرد آزما کر رہا تھا۔ وہ مقولہ کچھ اس طرح سے تھا کہ:

”ہر چیز کو یا یہ تکمیل تک پہنچنا عین ممکن ہے۔ مگر اس کے لئے عملِ پیہم چاہیے۔“

مجھے یقین ہے کہ یہ مقولہ میں نے کہیں اور سے اخذ کیا ہوگا مگر میرے دوست نے یہی سمجھا کہ یہ میری اپنی سوچ ہے۔ میرے دوست کو اور نہ ہی مجھے یقین آ رہا تھا کہ اس قدر معنی خیز مقولہ میں نے تحریر کیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس سادہ مگر بیش بہا قول نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا ہے اور اُسے میں اپنے ذریعہ معاش اور کاروبار میں ہمیشہ استعمال کرتا رہا ہوں۔

چھوٹے ہوتے ہوئے میرے بھائی عزیز کے ساتھ میرا وقت کم ہی گزرتا تھا۔ میں اپنی دونوں بہنوں کے زیادہ قریب تھا۔ سیمہ مجھ سے چھوٹی تھی اور نیشہ بڑی۔ شادی

کے بعد جب نیشہ کینیڈا آگئی تو سیمہ اور میں اور زیادہ قریب ہو گئے۔ میری دونوں بہنیں بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں، پیار کرنے والی، کان دھر کر بات سننے والی، ہوشیار، نرم دل اور میرا خیال رکھنے والی تھیں۔ سا لہا سال ہمارا ساتھ رہا۔ چھوٹی بہن سیمہ کے ساتھ میرا زیادہ وقت گزرا جو کہ بہت ہی نرم دل اور مہربان خاتون ہے۔ وہ بہت زیادہ مذہبی ہو گئی ہے۔ اُس کی عادتیں ہماری والدہ جیسی ہیں اور میں مزاحاً اُسے سیمہ امی جان کہتا ہوں۔

میں نے ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور یہ میرے اُستاد اور میرے والد دونوں کے لئے ایک حیران کن معجزہ سے کم بات نہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد میں نے ساہیوال گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور اس طرح مجھے آرام کا سانس لینا نصیب ہوا۔ وہاں مارنے کوٹنے والے کوئی اُستاد نہ تھے۔ بلکہ کالج کے تمام اساتذہ مہربان دوستوں کی طرح تھے۔

یہ ایک مردانہ کالج تھا اور ہر کلاس میں بیس سے چالیس تک کی تعداد میں طالب علم ہوتے تھے۔ وہاں میں نے نئے دوست بنا لئے اور ہم سب مل کر باقاعدگی سے فلمیں دیکھتے یا کالج کی کینیٹین میں وقت گزارتے۔ کبھی کبھی ہم کلاس سے غیر حاضر بھی ہو جاتے کیونکہ کالج میں وقت پر کلاس میں جا کر حاضری لگانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اور جو کچھ ہمارے جی میں آئے ہم کر لیتے تھے۔ اکثر میں اپنے دوستوں کے ساتھ باہر ریسٹورینٹ جا کر کھانا کھاتا۔ مجھے پتہ چلا کہ مجھے اپنے دوستوں کی تفریحی محفلوں میں رہ

کر زیادہ مزہ آتا ہے۔ میں اپنی والدہ کو کتابیں خریدنے کے لئے رقم حاصل کرنے کو کہتا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ میرے والد سے پیسے حاصل کر سکتی تھی۔ مالی معاملات میں میرا والد کافی حلیم تھا اور میرے کالج کے تمام اخراجات اُن دنوں کے مروجہ طریق کے مطابق وہ ہی برداشت کرتا تھا۔

جب میں اُن ایام پر نظر دوڑاتا ہوں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ میرے کالج کا زمانہ میری زندگی کا سب سے بہترین دور تھا۔ وہ چار سال میری زندگی کے انتہائی بے فکری کے سال تھے، کوئی ذمہ داری نہ تھی، ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور بہت ہی پُر لطف دن تھے۔

کالج میں میں نے ارادہ کوئی مشکل مضمون نہیں لیا تھا اور اپنے یار دوستوں کے ہمراہ وہاں کے آزاد ماحول سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کالج کی کٹھین میں سمو سے کھائے، جمعہ کے دن فلمیں دیکھیں اور اپنی نوجوانی کے ایام کا پورا مزہ اُٹھایا اور ان تمام لذتوں کے ساتھ میں نے معاشیات کے مضمون میں پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی سے امتحان بھی پاس کر لیا۔

1971 میں پاکستان ملٹری آفیسر اکیڈمی (پی۔ایم۔اے) کے ایک نو ماہی چھوٹے سے کورس میں میرا انتخاب ہو گیا۔ اُس وقت کے لحاظ سے یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اُس مشہور و معروف اکیڈمی میں داخلہ کے لئے جو کہ کاکول ایبٹ آباد میں واقع تھی میں نے بہت زیادہ محنت کی تھی۔ وہاں مجھے فوج کا ایک افسر بننے کی تربیت دی جا رہی

تھی۔ وہاں میں نے نظم و ضبط کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ عرصہ بعد اُسی علاقے سے اُسامہ بن لادن کو امریکی فوجی طاقت نے ڈھونڈ نکالا تھا اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ اتنی مدت وہاں کیسے چھپا رہا۔ وہ مقام جو کہ ایک انتہائی محفوظ فوجی قصبہ ہے۔

مگر میری فوجی تربیت صرف چھ ماہ تک رہی۔ 1972 میں مجھے پی۔ ایم۔ اے سے خارج کر دیا گیا کوئی وجہ یا وضاحت بتائے بغیر۔ آج تک مجھے معلوم نہیں کہ میرا اخراج کس بنا پر ہوا۔ اس سانحہ پر میں سخت آزرده تھا اور واپس گھر آنے کے بعد بھی میں بُری طرح گم سم رہا۔ میری افسردگی قابو سے باہر تھی۔

بہر حال میں نے ایک بار پھر یہ سبق سیکھا کہ بُرے حالات میں ضرور کوئی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے بشرطیکہ ہم اُن حالات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس واقعہ کے بعد میرے والد نے بھی میرے ساتھ بہت نرم روی اور مہربانی کا برتاؤ روا رکھا۔

پی۔ ایم۔ اے کا یہ تکلیف دہ تجربہ میرے لیے سمجھنا محال تھا، لیکن پھر بھی اُس نے مجھے زندگی کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کا موقع بہم پہنچایا۔ میں نظم و ضبط کا مزید پابند ہو گیا اور یہ سبق سیکھا کہ بُرے حالات پر فکر و غم میں ڈوب جانے کی بجائے آگے نکل جانے کا انداز اختیار کرنا بہتر ہے۔

بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ پی۔ ایم۔ اے سے باہر نکلا جانا زندگی میں میرے لئے ایک بہت ہی فائدہ مند بات تھی۔ اُس نے میرا مستقبل اور میری زندگی بدل کر رکھ دیئے۔ اگر میں فوج میں ہوتا تو ایک فوجی افسر کی حیثیت سے پاکستان میں ہی رہتا۔ اور

کبھی بھی میں وہ نہ بن سکتا جو کہ آج میں ہوں۔ زندگی کے راستے کی ان مشکلات اور رکاوٹوں نے مجھے مضبوط تر بنا دیا اور اپنی ناکامیوں پر فکر و غم نہ کرنا سکھایا کہ جن کا بعد میں مجھے کئی بار سامنا کرنا پڑا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ ہماری سب سے بڑی ناکامیاں دراصل ہمیں کامیابیوں کی جانب لے جانے کا باعث بنتی ہیں۔ ہم ماضی کے مشکل حالات کی یادوں کے دروازے بند تو نہیں کر سکتے، مگر اپنی غلطیوں، بدقسمتیوں اور تکلیف دہ حالات سے اپنے معیاروں اور قدروں کو بلند کرنا سیکھ سکتے ہیں۔ چاہے کاروبار ہو یا میری گھریلو زندگی، میں نے عمر بھر جانفشانی اور مستقل مزاجی سے کام کرنا اور آئندہ آنے والے انعامات پر نظر رکھنا سیکھا ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں کوئی اتنا زیادہ 'مذہبی' آدمی نہیں ہوں جتنا کہ ایک 'روحانی' انسان ہوں۔



خوش آئند شادی

1971 کے موسم گرما کی بات ہے کہ ایک دن میرے والد گھر کے ایک کونے میں بڑی دیر تک اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھے غمگین نظر آ رہے تھے۔ جب کبھی وہ پریشان ہوتے تو اُن کی عادت تھی کہ گھبراہٹ کے عالم میں بیٹھے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گھماتے رہتے۔ اُن کے چہرے کے بال بڑھے ہوئے تھے، آنکھیں پٹھر مڑدہ کہ جیسے وہ کوئی انتہائی سنجیدہ مسئلہ حل کرنے کی سوچ میں مبتلا ہوں۔ میری والدہ اُن کی دلجوئی کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح اُن کی فکر مندی دُور کر سکیں، مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔ میں اُس وقت اٹھارہ سال کا تھا۔

بُشریٰ جو کہ میری خالہ زاد تھی، ہمارے ساتھ تقریباً دو سال سے رہ رہی تھی اور وہ بھی غمزدہ اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس سال کے آخر میں جب میرے بھائی عزیز نے کینیڈا سے واپس پاکستان آنا تھا تو اُسکے ساتھ بُشریٰ کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔

میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ہر ایک اس قدر کیوں افسردہ اور پریشان ہے! کئی خیالات میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ کیا میرے والد مالی مشکلات کی وجہ سے غمگین ہیں؟ کیا ہماری فصلیں خراب ہو گئی ہیں؟ مگر میں یہ باتیں اپنے والد سے پوچھ

نہ سکتا تھا کیونکہ وہ نظم و ضبط کے پابند تھے۔ اس لئے اس قسم کے سوالات پوچھنا مناسب نہ تھا، خصوصاً جب کہ وہ غم کی حالت میں ہوں۔ میرے والد قابلِ احترام بزرگ اور ہمارے گھر کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لئے اکیلے وجود تھے۔ میں پہلے بھی ذکر کر آیا ہوں کہ وہ میرے ساتھ پیار و محبت کا اظہار کم ہی کرتے تھے، نہ ہی تنہائی میں اور نہ ہی لوگوں کے سامنے۔ یہ تو پکی بات تھی کہ چھوٹی موٹی ذاتی گفتگو کرنے پر وہ کبھی بھی مائل نہ ہوتے۔ اُن کی باتیں میں دُور کھڑا ہو کر تو سُن سکتا تھا مگر منہ بہ منہ سوال جواب کرنے کی مجھے اجازت نہ تھی۔

اُس دن چونکہ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ یقیناً کوئی نہ کوئی بڑا واقعہ ظہور پزیر ہوا ہے۔ اس لئے اصل حقیقت معلوم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ میرے پاس تھا کہ میں اپنے والدین کے درمیان ہونے والی باتیں چپکے سے سنوں۔ اس طرح میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا:

”میں بُشریٰ کے باپ صالح کو کیا کہوں گا؟“

پھر آہستہ آہستہ مجھے اُن سب کے غم اور پریشانی کی وجہ سمجھ آنا شروع ہو گئی۔ عزیز نے ایک خط میں والد کو لکھا تھا کہ وہ بُشریٰ سے اپنی منگنی توڑ رہا ہے! اسی بنا پر میرے والدین غمزدہ اور پریشان تھے کہ اس مشکل کا کیا حل نکالا جائے! کیونکہ تمام لوگوں کو اطلاع ہو چکی تھی کہ جلد ہی عزیز اور بُشریٰ کی شادی ہونے والی ہے۔ اسی لئے گھر میں ہر ایک افسردہ اور فکر مند تھا۔ ہم جانتے تھے کہ یہ بات خاندان میں انتہائی

تکلیف اور مایوسی کا باعث بنے گی۔ میرے والد ہر طرح سے کوشش کر رہے تھے کہ یہ جوڑ قائم رہے اور یہ رشتہ نہ ٹوٹے۔

عزیز کی منگنی کو بہتر طور سے سمجھنے کے لئے میں آپ کو اُس وقت کی طرف لے چلتا ہوں جہاں سے قصہ شروع ہوا تھا جب عزیز اور بشریٰ دونوں ننھے مئے بچے تھے۔ دونوں کی پیدائش میں صرف چند ماہ کا فرق تھا۔ ہمارے نانا اور نانی نے یہ فیصلہ کیا کہ بڑے ہونے پر وہ دونوں آپس میں شادی کریں۔ اُس وقت کے رائج طریق کے مطابق یہ ایک آسان اور قابلِ عمل فیصلہ تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں والدین یا گھر کے بزرگوں کا اس طرح چھوٹے بچوں کے رشتے طے کرنے کا رواج عام تھا۔ اسی طرح بھائی بہنوں کے بچوں کا آپس میں شادی کا رشتہ طے پانا کوئی معیوب بات نہیں تھی جیسے کہ ایسے رشتے آجکل مغربی معاشرے میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔

وہ 1969 کا سال تھا جبکہ بشریٰ تقریباً 21 سال کی تھی کہ اُس کے والدین نے اسکی منگی کا انعقاد کیا۔ عزیز اس وقت کینیڈا میں رہ رہا تھا۔ منگنی کی اس تقریب سے ہمارے خاندان اور قریبی دوست احباب میں ایک لحاظ سے باقاعدہ اعلان ہو گیا کہ بشریٰ اور عزیز کی شادی ہوگی۔ اُس تقریب میں شمولیت کے لئے ایک دن کی رخصت پر ہم شادیوال پہنچے جہاں بشریٰ رہتی تھی۔ واپسی پر ہم اُسے اپنے ساتھ لے آئے اور وہ ہمارے ساتھ رہنے لگی۔ اُن دنوں عزیز کینیڈا میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور گھر والوں کا یہی ارادہ تھا کہ دو سال بعد جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس پاکستان آئے گا تو باقاعدہ

طور سے اُس کی شادی کا اہتمام کر دیا جائے گا۔

اب جو میں ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو یہ بات بہت عجیب لگتی ہے کہ اُس شادی سے متعلقہ تمام فیصلے میرے والد اور بُشریٰ کے والد نے از خود کیسے کر لئے تھے! ایسا کرنا ایک عام رواج تو تھا اور خاندانوں کی سہولت کا بھی باعث تھا لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میرے والد نے از خود ایسا کرنے کا کیوں سوچا!

بہر حال ساہیوال آکر بُشریٰ بالکل ہمارے اپنے گھرانے کے فرد کی طرح ہمارے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ میری چھوٹی بہن سیمہ اور میری والدہ کے ساتھ مل کر تمام گھریلو کام کاج کرتی۔ تعلیم حاصل کرنے پر بھی اُس پر کوئی پابندی نہ تھی اور اُس نے ساہیوال کے لڑکیوں کے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔

وہ عمر میں مجھ سے چار سال بڑی تھی۔ جب وہ ساہیوال آئی تو اُس وقت میں تقریباً 17 سال کا تھا۔ بُشریٰ کے بچپن کی زندگی رنج و ملال کا ایک تاریک المیہ تھا اور جس نے بلوغت کی عمر میں اُس کے مزاج کی تشکیل کو کافی زیادہ متاثر کیا۔ جب وہ صرف پانچ سال کی تھی کہ اُسکی والدہ بہ عمر تیس سال اپنے تیسرے بچے کی ولادت کے دوران وفات پا گئی اور ساتھ ہی وہ بچہ بھی فوت ہو گیا۔ بُشریٰ کی والدہ کا نام اقبال تھا اور وہ بہت مذہبی اور خاموش طبع خاتون تھی۔ رشتہ میں وہ میری خالہ تھی۔ رشتہ داروں کی زبانی اُن کے بارہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن صبح سویرے جب کہ خالہ اقبال فجر کی نماز پڑھ رہی تھی اُن کے گھر میں ایک چور گھس آیا۔ چور کی نظر اُن پر پڑی تو یہ سوچ

کر کہ وہ ایک نمازی کو محل کر کے کوئی بدشگونئی اپنے سر نہ لے لے، اُس نے فیصلہ کیا کہ کچھ دیر کے بعد دوبارہ آ کر چوری کر لے گا۔ دو گھنٹوں کے بعد جبکہ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا وہ دوبارہ آیا اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ ابھی تک اُسی جگہ عبادت میں مصروف تھی اور خدا کے آگے رکوع و سجود بجالا رہی تھی۔ اُس چور نے افسوس کی آہ بھری اور یہ فیصلہ کیا کہ کسی اور وقت آئے گا۔ صبح ہونے پر اُس نے پھر چوری کرنے کا ارادہ کیا اور جب گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر کہ وہ ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی ہوئی ہے اُس کے غصے اور مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی اور آخر ہمت ہار بیٹھا اور واپس نکل گیا۔ اس طرح خالہ اقبال کے ایمان اور دعاؤں نے کم از کم انہیں ایک امکانی ڈاکہ زنی سے بچا لیا۔ اُن کے متعلق مزید باتوں کا علم نہیں کیونکہ بد قسمتی سے وہ اپنی جوانی ہی میں جلد وفات پا گئیں۔

اقبال خالہ کی وفات کے بعد بُشریٰ کے والد نے اقبال خالہ کی چھوٹی بہن خالہ امی جان سے شادی کر لی۔ دونوں کی خوش قسمتی کہ یہ جوڑ ہر لحاظ سے اُن کی شادمانی کا باعث بنا۔ خالہ امی جان کی طبیعت اپنی بہن کی طبیعت سے بالکل مختلف تھی۔ وہ ہنس مکھ، مہمان نواز، فیشن کی دلدادہ محفل کی جان اور باتونی خاتون تھیں اور اُس زمانے کی عورتوں سے مختلف کافی مَنہ زور بھی تھیں۔

اُن کو اپنے ناخنوں پر سُرخ نیل پالش اور ہونٹوں پر سُرخ لپسٹک لگانے کا بہت شوق تھا۔ اور ہر چمکدار بھڑکیلی چیز اُن کو پسند آ جاتی۔ وہ نماز و دعا کی اتنی زیادہ پابند نہ

تھیں اور شادی کے بعد ہر سال ایک بچہ جنم دینا شروع کر دیا۔ صالح خالو بھی جوان تھے اور اُسی طرح کے رنگین مزاج تھے۔ وہ پاکستان کی گرمیوں کے موسم میں بھی عمدہ سا سوٹ پہن کر اتراتے پھرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بازو پر ایک کالانش بھی بنوایا ہوا تھا اور کان میں بالی بھی پہنتے تھے۔ اُن دنوں جسم پر نقوش بنانا اور کانوں میں بالی ڈالنا باغیانہ اقدام تھے۔ وہ خوش شکل بھی تھے جس سے اُن کے تیور میں اضافہ ہو گیا تھا۔ صالح خالو نے پہلے تو پاکستان نیوی میں ملازمت کی اور بعد میں حکومت پاکستان کے ایک سول آفیسر کے طور پر راولپنڈی میں کام کرتے رہے۔ شادیوں میں اُن کے تین مکان اور زمین تھی جو کہ گجرات شہر کے قریب ایک گاؤں تھا۔ اُن کا سب سے زیادہ پسندیدہ مکان شادیوں کے عین درمیان میں واقع تھا اور وہ بڑے فخر سے اُسے شیش محل، کہا کرتے تھے۔

اُنکا اور خالہ امی جان کا ہر لحاظ سے ایک کا مل جوڑا تھا۔ وہ خالہ سے بہت محبت کرتے اور اُنکا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ دونوں کے گل آٹھ بچے تھے، چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ اُن بچوں کے علاوہ بُشریٰ اور ایک بیٹا پہلی بیوی اقبال سے تھے۔ بُشریٰ کو چھوٹی عمر ہی سے ان تمام بچوں کی پرورش کرنا پڑی اور اس کے ساتھ گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹانا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ خالہ امی جان زیادہ وقت خالو صالح کے ساتھ راولپنڈی میں گزارتی اور تمام بچوں کی دیکھ بھال بُشریٰ کے حوالے کر جاتی۔

بُشریٰ صبح سویرے اُٹھتی اور گھر کا کام کرنا شروع کر دیتی۔ لکڑیوں سے آگ جلاتی

تاکہ سب کو صبح کی چائے مل جائے۔ پھر صبح کا ناشتہ تیار کرتی۔ صفائی کرتی اور گھر کے باقی تمام کام کرتی۔ اس طرح چھوٹی عمر ہی سے بُشریٰ کی زندگی کافی سخت گزر رہی تھی۔

اُس کے والدین خود تو دونوں آزاد مناش تھے مگر مردِ وجہ طریق پر عمل کرتے ہوئے وہ بُشریٰ کو نئی طرز کے کپڑے پہننے اور گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ بُشریٰ نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ عید پر پہننے کے لیے اُن کے والد ہاتھوں کے کڑے خرید کر لائے اور اُس نے خوشی خوشی وہ کڑے پہن لئے۔ لیکن جب والد صاحب نے بُشریٰ کی کلائیوں پر وہ کڑے دیکھے تو ناراض ہو کر زور سے چلائے:

”اُس کو کہو کہ اُن کو اتار دے۔ مجھے اچھے نہیں لگ رہے۔“

یہ سنتے ہی امی جان نے بُشریٰ کو حکم دیا کہ وہ فوراً اپنے ہاتھوں سے کڑے اتار دے!

بُشریٰ کو پردہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ اُس کو اپنا چہرہ باہر کے لوگوں کو دکھانے کی اجازت نہ تھی۔ اُن دنوں والدین اپنی لڑکیوں پر سختی سے ایسی پابندیاں عائد کیا کرتے تھے۔ اس لئے بُشریٰ کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے باپ اور سوتیلی ماں کی زندگی کے آزادانہ رہن سہن کے طور طریقوں کو اپنائے۔ برخلاف اِس کے اُس سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ خاموشی سے گھر کا کام کاج کرتی رہے اور مردِ وجہ رسم و رواج کی سختی سے پابند رہے۔

ان تمام پابندیوں پر بُشریٰ نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی اور سب کچھ انتہائی صبر کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔ وہ صبح سویرے اُٹھتی اور بغیر کسی احتجاج کے گھر کے ڈھیروں

کام کرنا شروع کر دیتی۔ کنوئیں سے پانی نکالتی، بالٹیوں میں بھرتی تاکہ گھر والے اُس پانی سے کھانا پکاسکیں، صفائی کر لیں اور نہالیں۔ اُسکا ایک بڑا گھرانہ تھا اور اُن کے بے شمار کپڑے اُسے ہاتھ سے دھونے پڑتے۔ دھونے کے لئے کپڑوں کو سینٹ کی سل پر کوٹنا پڑتا اور پھر ہاتھوں سے نچوڑ کر رسیوں پر لٹکانا پڑتا تاکہ سورج کی تپش سے سوکھ جائیں۔

بشریٰ کو روزانہ بے شمار روٹیاں بھی پکانا پڑتیں وہ خود اپنے ہاتھوں سے آٹا گوندھتی، پیڑے بناتی اور ہتھیلیوں پر ٹینچ ٹینچ کر گول روٹیاں بناتی اور گرم توڑے پر ڈالتی۔ یہ کافی تکلیف دہ اور تھکانے والا کام تھا۔ اس طرح ہاتھوں سے روٹیاں پکانے سے اُس کی ہتھیلیوں میں درد ہونا شروع ہو جاتا۔ اکثر اوقات چولھے کی آگ کی چنگاریاں بھی اُس کے چہرے پر پڑ جاتیں مگر پھر بھی کبھی وہ کسی سے شکوہ شکایت نہ کرتی۔ پاکستانی گاؤں میں رہنے والی اُس لڑکی کو جو اپنے بھائی بہنوں میں عمر میں سب سے بڑی ہوتی یہ عمومی کام دھندے کرنا پڑتے تھے۔

بشریٰ اپنے سگے اور سوتیلے بہن بھائیوں کی 'باجی' تھی۔ جب کبھی باجی ناراضگی کا اظہار کرتی تو سب بھائی بہن جانتے تھے کہ وہ گھر کا نظام چلانے کی ذمہ دار ہے اور نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے چھڑی سے سزا دینے کا عام رواج تھا جس سے وہ سب خوفزدہ رہتے تھے۔ اُس کی سب سے چھوٹی بہن نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ بچپن میں باجی کے خوف کے مارے سب کی جان نکل جایا کرتی تھی، جونہی کسی کو پتہ چلتا کہ

باجی کہیں قریب ہے تو وہ فوراً ایک دوسرے کو کہتے کہ باجی آرہی ہے، جلدی سے چھپ جاؤ!

وہ بڑی سخت طبیعت مشہور تھی اور گھر میں تمام لڑکے اور لڑکیاں ہر وقت ڈرتے رہتے تھے کہ اگر وہ ناراض ہوگئی تو خدا جانے کیا کر گزرے گی۔ کافی مدت کے بعد ایک دفعہ بُشریٰ نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کو بتایا:

”میرا بچپن تمہارے بچپن سے بہت زیادہ کٹھن گزرا ہے۔ تم تو سب سے چھوٹی تھی اس لئے کافی بگڑی ہوئی تھی!“

گھر میں سب سے بڑی بہن سے جن باتوں کی توقع رکھی جاتی تھی، بُشریٰ بھی ویسا ہی رویہ رکھتی تھی۔ لیکن بہت سی باتیں اُس کی اپنی اصلی طبیعت کے برخلاف تھیں۔ حقیقت میں بُشریٰ بہت نرم مزاج اور کشادہ دل تھی اور اس کی یہ خوبیاں اُسکی زندگی کے بعد کے ایام میں لوگوں کے سامنے اجاگر ہوئیں۔

اُس کی سوتیلی ماں امی جان دوسروں سے خوب کام لینا جانتی تھی، بُشریٰ نے بھی کئی باتیں امی جان سے سیکھیں اور اسی طرح امی جان نے بُشریٰ سے بہت کچھ سیکھا۔ دونوں اکثر اوقات ایک دوسرے کے عادتوں کی نقالی کرتی تھیں۔ امی جان کو صفائی پر بہت زیادہ اصرار رہتا اور کھانے سے پہلے تمام تھالیاں ہمیشہ گرم پانی سے دھوتی اور اسی طرح چائے سے پہلے چائے کی پیالیاں بھی گرم پانی سے کھنگالتی تھی۔ بُشریٰ نے بھی ایسی بہت سی عادتیں اپنائی تھیں۔ دونوں کو سُرخ لپسٹک لگانا اور سُرخ ناخن پالش لگانا بھی

بہت محبوب تھا۔ بشری انیس کپڑوں کی بھی دلدادہ تھی اور خصوصاً کالے رنگ کے کپڑے اُسے بہت پسند تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کا باہمی پیار بھی بڑھتا گیا اور انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ شادی وال سے بشری نے جب دسویں کا امتحان پاس کر لیا تو اس کے والد نے اسے ایک حکومتی ٹیچر ٹریننگ پروگرام میں داخلہ دلوا دیا۔ کچھ عرصہ بعد اُس نے اپنے گھر کے نزدیک ایک خستہ حال مڈل اسکول میں پڑھانا شروع کیا اور بچوں کو مختلف مضامین اُردو میں پڑھاتی تھی۔ اسکول سے اُس نے اپنی کلاس سے تین چار طالب علم اپنے گھر کے کاموں میں مدد کے لئے بھی چُن لئے۔ غیر متوقع طور پر اُن میں سے ایک لڑکی اُس کی بے حد مداح خواں ہو گئی اور اُس کی تعریف میں لمبے لمبے خط لکھنے شروع کر دیئے۔ اور بشری کے وہاں سے چلے جانے کے بعد بھی لکھتی رہی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بشری کے ہمدردی اور رحمدلی کے جذبات مسکور گُن تھے۔ حالانکہ وہ سخت جان تھی لیکن دل کی حلیم اور کشادہ دل تھی۔

1960 کی دہائی کے دنوں میں پاکستان میں رہنا نوجوان لڑکیوں کے لئے مشکل مرحلہ تھا، جب کہ باقی دنیا میں بیٹلز، ایلوس، رولنگ سٹون اور ناچ گانوں کی محفلیں ہر دلعزیز تھیں لیکن وہاں ہم صدیوں پرانے رسم و رواج میں جکڑے ہوئے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو آپس میں بات چیت کرنے کی اجازت نہ تھی اور دوستانہ رنگ میں باہم ملنا جلنا تو قطعاً منع تھا۔

جس علاقے میں میں بڑا ہوا وہاں بڑی سختی سے ان اصولوں پر پابندی کروائی جاتی تھی خصوصاً لڑکیوں پر۔ اگر لوگوں کو کسی طرح پتہ چل جاتا کہ کسی لڑکی کا کسی لڑکے کے ساتھ معاشقہ ہے تو پھر اُسے اپنی ساری زندگی شرمندگی اور ذلت آمیز رسوائی میں گزارنی پڑتی تھی۔

البتہ لڑکوں کے لئے ماحول قدرے بہتر تھا۔ لوگ سرگوشیاں تو کرتے کہ بڑا خراب لڑکا ہے، مگر اُسے ملازمت مل جاتی، شادی کر لیتا اور بالآخر ایک معیاری زندگی بسر کر سکتا تھا۔ ہم سب کو یہ معلوم تھا اگر ہم ایک دوسرے سے نازنخرے کرتے یا پیار محبت جتاتے اور لوگوں کو پتہ چل جاتا تو یہ آگ کے ساتھ کھیلنے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود کہ ہماری حرکت کتنی ہی معصومانہ ہوتی، ہم اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزتی کا باعث بن سکتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود چونکہ نوجوانی کا عالم تھا، ہم سب خطرات مول لینے کے لئے تیار رہتے اور اسی میں خوب مزہ آتا تھا۔

لڑکیوں کے ساتھ باہم ملنے جُلنے پر اس قدر سختی کیوں تھی اس کی کئی وجوہات تھیں۔ بنیادی وجہ تو عورتوں کو خواہ مخواہ تنقید کا نشانہ بنانا تھا جو کہ بد قسمتی سے ابھی تک دنیا کے اکثر ممالک میں مروج ہے۔ عورت کی قدر و قیمت کا انحصار اُس کی نیک زندگی گزارنے اور بچے پیدا کرنے پر تھا۔ اس لئے اُس کی پاکیزگی اور عصمت کی حفاظت لازمی امور گردانے جاتے تھے۔ جو بات ضروری تھی وہ یہی تھی کہ شادی کرے، حاملہ ہو اور بچے جنم لے۔ اُس کا تعلیم یافتہ ہونا یا زندگی کی دوسری قدروں میں ترقی کرنا لازمی نہیں تھا

اور اسی لئے ان باتوں پر کوئی خرچہ نہ اٹھایا جاتا۔

اس کے علاوہ پاکستان میں مردوں کے بالمقابل عورتیں کم مرتبہ جنس تصور ہوتی تھیں جن کا کام صرف یہ تھا کہ کھانا پکائیں، بچے پیدا کریں، بچوں کی دیکھ بھال کریں اور گھر کے اندر رہیں۔ شادی کے بعد ہمیشہ اپنے خاوندوں کی تابعداری کریں۔ شادی سے پہلے لڑکیوں کو اپنے والدین، بڑے بھائیوں اور دیگر مردوں کا فرمانبردار رہنا پڑتا تھا۔ کپڑے پہننے کے متعلق بھی کافی سخت قواعد تھے خاص کر دیہاتوں میں تو باپ، بیٹے اور خاوند گھریلو عورتوں کے ساتھ پالتو جانوروں جیسا سلوک روار کھتے تھے جو کہ انتہائی تشویشناک بات تھی۔

یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اب میں اپنے تمام رشتہ داروں کو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوائیں اور دنیاوی کاموں کے سیکھنے پر زور دیں تا کہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے لطف اندوز ہوں، کیونکہ محنت اور ہنرمندی سے رزق کمانا ایک تسلی بخش کام ہے جس سے ہر ایک کو لطف اندوز ہونا چاہیے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔

میں اپنی نوجوانی میں ایک شرمیلا مگر کھلنڈرا لڑکا تھا اور قدرے ضدی بھی تھا۔ اور اپنے بڑوں کی محفل میں اکثر خاموش رہتا تھا۔ اُن دنوں پاکستان میں سڑکوں کے کنارے تمسخر اڑانے والے لڑکوں کے ٹولے بھی کھڑے نظر آتے تھے۔ اگر آپ نے مختلف ممالک کی سیر کی ہے تو آپ نے جنوبی ایشیا کے شہروں میں دیکھا ہوگا کہ ایسے

لڑکوں کے ٹولے عام طور پر سڑکوں کے چوراہوں پر بیکار کھڑے رہتے تھے اور گزرنے والی خوش شکل لڑکیوں پر آوازے کستے ہیں۔ امریکہ کے بڑے شہروں میں بھی جہاں کوئی تعمیراتی کام ہو رہا ہو وہاں ایسے نظارے عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں کبھی بھی کسی ایسے ٹولے میں شامل نہیں ہوا تھا۔ مجھے انکا اس طور سے بیکار کھڑا ہونا اور آوازے لگانا بے حد ناپسند تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر میں اُن میں شامل ہو گیا تو میں ایک سفیلے پن کا مرتکب ہوں گا اور میں اپنی زندگی کی قائم کردہ اقدار اور لوازم کو پست کر دوں گا۔

عورتیں تو رواجی کپڑے پہنتی تھیں مگر اس کے برخلاف مرد حضرات مغربی طرز کے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ گھر سے باہر جاتے ہوئے میں بھی عام طور پر ویسے ہی کپڑے پہنا کرتا تھا۔ مگر گھر میں ہمیشہ پاجامہ یا شلوار قمیض پہنے رکھتا تھا۔ لڑکپن میں 1960 اور 1970 کے سالوں میں میرا قد پانچ فٹ دس انچ اور وزن 150 پاؤنڈ تھا۔ میرا جسم دُبلّا پتلا اور منہ پر مونچھیں تھیں۔ داڑھی نہ تھی اور میں بال چھوٹے رکھتا تھا۔ عید کے دن میں ایک لمبا کوٹ پہنتا اور نیچے کھلے پانچے والی پینٹ پہنا کرتا تھا اور یہی اُن دنوں کا فیشن تھا۔

کالج میں طالبعلمی کے دوران میرے ایام کا خلاصہ دوست، فلمیں اور مطالعہ تھا۔ اور یہی اُس حصّہ زمین میں اکثر نوجوانوں کے رہن سہن کا طریق تھا۔ مگر ان تمام باتوں سے بالکل مختلف دور تھا جس میں سے میرے والد گزر رہے تھے۔ وہ خاندان کے ایک

انتہائی تشویشناک مرحلہ کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ مجھے اپنے والد کی تکلیف کا پورا احساس تھا مگر میں اُن کے خود ساختہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیے نہ کوئی مشورہ دے سکتا تھا اور نہ ہی اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، بُشری پہلے سے زیادہ مغموم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن اُس نے غلطی سے ڈیٹول کی جراثیم کش دوا کی ضرورت سے زیادہ خوراک پی لی، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید اُس دوا سے اُس کے غم میں کچھ کمی آجائے مگر اُس کے اثر سے اُس کی طبیعت ناساز ہو گئی اور ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑا۔ خوش قسمتی سے چند دن بیمار رہنے کے بعد اُس کی طبیعت مکمل طور سے بحال ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد سے میرے والد اور زیادہ متفکر اور پریشان ہو گئے اور انہیں یہ خوف لاحق ہو گیا کہ بُشری کہیں اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حرکت نہ کر بیٹھے جو ہمارے خاندان کے لئے شرمندگی اور بدنامی کا باعث بن جائے۔ مجھے تو بالکل یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جو بھی بُشری نے کیا اُس کی وجہ کیا تھی۔ ایسا حادثہ بھی ہو سکتا تھا، مگر میں اتنا سادہ بھی نہ تھا کہ اس کو مان لیتا۔ یقیناً بُشری کی تکلیف اور نا اُمیدی اپنی انتہا پر ہوگی۔

ایک بار میں نے بُشری سے پوچھا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں جب اُسکی اپنی والدہ اُس سے جدا ہو گئی تھی تو اُس وقت اس نے کیا محسوس کیا تھا؟ لیکن اُس کو اپنی والدہ سے وابستہ باتیں بہت کم یاد تھیں۔ اُسے زیادہ باتیں اپنی سوتیلی امی جان کی یاد تھیں۔

میرے لئے یہ تصور کرنا بہت محال ہے کہ اُس نے اتنی چھوٹی عمر میں اپنے سوتیلے

بہن بھائیوں کی کیسے دیکھ بھال کی جبکہ وہ خود اپنی دیکھ بھال کے لئے بھی تیار نہ تھی۔ لازماً بشری کی طبیعت پر بے دلی اور فکر مندی کے اثرات بہت ہی چھوٹی عمر سے پڑنا شروع ہو چکے ہونگے جبکہ وہ شادی وال میں اپنے والدین کے ساتھ رہائش پزیر تھی اور یہ لازمی بات ہے کہ وہ خود کو تنہا، خوفزدہ اور غیر محفوظ محسوس کرتی ہوگی۔

جن دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک آزادانہ زندگی کے مزے اٹھا رہا تھا بشری اُن دنوں ذمہ داریوں کے ایک گراں بار بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، پہلے اپنے گھر میں اور پھر ہمارے گھر آنے کے بعد۔ صرف ایک ہی خوش گن بات تھی جس کی کہ وہ منتظر تھی یعنی عنقریب ہونے والی اُس کی اپنی شادی جو کہ اُس کی تمام مشکلات کا حل تھا۔ اس لئے وہ مستقبل میں اپنی خوشگوار زندگی، گھرانے اور اپنے ہونے والے بچوں کے تصور میں مگن رہتی تھی۔ پس اچانک اس بات کا پتہ چلنا کہ اُسکے یہ سارے سہانے خواب ادھورے رہ جائیں گے، اُس کے لئے ایک انتہائی تباہ کن اطلاع تھی۔

اُسکا ڈیوٹل پی لینا کئی باتوں کی غمازی کر رہا تھا۔ اُسے اپنی مشکل کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے حد غمزدہ اور غصے میں تھی اور اس کیفیت سے نجات کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ اُن حالات سے فرار حاصل کر لے۔ وہ نہ تو کسی کو بتا سکتی تھی کہ اُس پر کیا گزر رہی ہے اور نہ ہی کسی سے گلہ کر سکتی تھی کہ اُسکے ساتھ زندگی نے ایسا بے انصافی اور لا پرواہی کا سلوک کیوں روا رکھا۔

اسی دوران خالوصالح کو بھی حالات بدل جانے کی اطلاع مل گئی اور اُس پر غیض و

غضب کا سخت دورہ پڑا۔ اُنہوں نے میرے والد اور باقی تمام گھرانے والوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور قسم کھائی کہ وہ ضرور ہم سے انتقام لے گا۔ اُس نے میرے والد پر الزام لگایا کہ اُس نے اُسکی بیٹی کی زندگی تباہ کر کے سب گھرانے کو بدنام کر دیا ہے۔ چیخ چیخ کر اُس نے پوچھا کہ منگنی ہو جانے کے بعد اب وہ اپنی بیٹی کو واپس اپنے گھر کیسے لاسکتا تھا؟

”تم نے تقریباً دو سال تک میری بیٹی کو اپنے گھر رکھا۔ تم اب اُس کے ساتھ کیوں ایسا سلوک کر رہے ہو؟ اُس نے تمہیں کیا تکلیف پہنچائی ہے؟“

در اصل خالوصالح کے غصّہ کی وجہ یہ تھی کہ اب اُسے بُشریٰ کے لئے کوئی مناسب رشتہ تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا کیونکہ اُس کی ایک بار منگنی ہو چکی تھی اور وہ اپنے ہونے والے خاوند کے گھر تقریباً دو سال تک رہ چکی تھی۔ کسی کو کیا خبر کہ اُس نے وہاں کیسے دن بسر کئے اور اگر وہاں اس کے ساتھ بدسلوکی ہوتی رہی تو اس کا کیا حل تھا؟ کسی نئے آدمی اور اُس کے خاندان کو ان تمام حالات کی اصلیت کا کیسے پتہ چلے گا اور وہ کیوں کسی کی بات کا اعتبار کریں گے؟ مجھے بعد میں یہ بات سمجھ آئی کہ اُن دنوں خالوصالح کیوں اس قسم کا ردِ عمل دکھا رہے تھے۔ باپ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی بیٹی کا بھلا چاہتے تھے کہ وہ ہر تکلیف اور مصیبت سے محفوظ رہے اور اُس کے اپنے خاندان کی عزت بھی برقرار رہے۔

دونوں اطراف کے بزرگ اس تلخ باہمی ناچاکی سے بچنا چاہتے تھے کیونکہ اس سے اُن کے عزت و احترام کو خطرہ لاحق تھا اور انہوں نے اس مسئلہ کے حل کی تلاش شروع کر دی۔ اُن کو وہ حل بالکل اپنی آنکھوں کے سامنے موجود مل گیا، یعنی میں! مجھے قربانی کا دنبہ بنایا گیا اور جب میرے والد نے مجھے بُشریٰ سے شادی کرنے کے لئے چُن لیا تو اُس وقت میری عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ میرے والد نے بڑی سختی سے اپنا پختہ فیصلہ سنایا کہ گھر کی عزت و آبرو قائم رکھنے کے واسطے مجھے بُشریٰ سے لازماً شادی کرنا ہوگی۔

میں تو ابھی نو عمر تھا اس لئے اپنی شادی کی تفصیلات کچھ زیادہ یاد نہیں۔ میرے دماغ میں تو اپنی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کرنے کا دلکش تصور تھا اور روشن مستقبل کے خیالات موجزن رہتے تھے۔ مگر اب معاملہ بالکل اُلٹ گیا تھا اور ایک ہی ساعت میں میرے تمام خواب چکنا چور ہو گئے!

شادی کرنا میرے لئے بالکل ایک انوکھی چیز تھی اور مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ مجھے کس راہ لگنا ہے۔ جوں ہی میری شادی ہونا طے پا گئی تو فوری طور پر بُشریٰ کی طرف میرا ملا جُلا رجحان ایک جھنجھلاہٹ کی صورت اختیار کر گیا اور یہ بات بالکل واضح طور پر نظر آ رہی تھی کہ میرے ساتھ شادی طے ہونے پر بُشریٰ بھی اتنی ہی ناخوش تھی جتنا کہ میں تھا۔ وہ پہلے ہی خود کو مُستر دشدہ محسوس کر رہی تھی اور اب اُسے ایک ایسے شخص سے شادی کرنا پڑ رہی تھی جو کہ نہ صرف اُس سے عمر میں چھوٹا تھا، بلکہ بے روزگار بھی تھا۔ اغلباً

اسی بات نے اُسے مزید افسردہ کر دیا۔ آپ کے ذہن میں ضرور یہ سوال اُٹھ رہا ہوگا کہ جلد بازی میں کئے گئے ان فوری فیصلوں کے خلاف ہم دونوں نے کیوں نہ کوئی قدم اٹھایا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال کہ اُس وقت ہم انکار کر سکتے تھے ہمارے ذہنوں میں آنا ہی محال تھا۔ والدین کے کھیلے جانے والے ڈرامہ میں ہم دونوں کی حیثیت فقط اداکاروں جیسی تھی اور جو اقدامات بھی جلد بازی میں اٹھائے گئے تھے وہ رسم و رواج کے مطابق اور خاندان کا وقار برقرار رکھنے کی خاطر لازمی تھے۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ اس اداکاری میں مجھے ایک تابعدار بھولے بھالے نوجوان کا کردار ادا کرنا ہے۔ مگر اُس کے بعد خاوند اور باپ بننے کا کردار کیا ہوگا اُس سے مکمل طور پر نابلد تھا۔ لیکن کھیل چونکہ شروع ہو چکا تھا اس لئے مجھے سب سے اہم اداکار کا کردار ادا کرنا لازمی ہو گیا۔ ہم دونوں غیر محفوظ تھے اور اُن ایام کے سماجی طور طریقوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن چکے تھے۔ بہر حال شادی کرنے میں مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

جون 1971 میں جس دن میری شادی تھی، اُس صبح میں جلدی اُٹھ گیا اور کچھ وقت اپنی والدہ اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ گزارا جو کہ شادی کی تقریب میں شامل ہونے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میری والدہ رنجیدہ تھی اور ظاہر تھا کہ جو کچھ ہونے والا تھا وہ اُسے پسند نہ تھا۔ اُس نے اس شادی کے خلاف اپنی آواز اُٹھائی تھی مگر میرے والد کی بلند اور زوردار آواز کے آگے اُس کی کسی نے نہ سنی اور میرے والد کا

جاری کردہ حکم برقرار رہا۔ آخر ایک نوجوان لڑکے اور اُسکی ماں کی مخالفانہ بات کو مردوں کی پُرتسلط سوسائٹی میں کون سننا تھا۔ شادی کی تیاری میں بھی عجلت برتی گئی۔

درحاشیہ یہ بھی بتلاتا چلوں کہ میرے تمام بھائی بہنوں اور میرے تمام بچوں کی شادیاں بڑے دھوم دھام سے ہوئی ہیں۔ ان شادیوں کے برعکس صرف میری شادی بڑی سنجیدگی اور دقیانوسی طور سے ہوئی جو کہ محض خاندان کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے عمل میں لائی گئی تھی۔

بہر حال بُشریٰ اپنی شادی کے دن بہت خوش نظر آ رہی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ دُبل پتلی اور خوش شکل تھی۔ اُس کا قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن تقریباً ایک سو دس پونڈ تھا۔

بہر صورت وہ دن نہ میرے لئے اور نہ ہی بُشریٰ کے لئے کوئی خوشیوں کا دن تھا۔ نہ ہی اُس کا خاندان خوش اور نہ ہی میرا خاندان خوش۔ چند دوست احباب اور رشتہ دار جنکو میرے والد نے مدعو کیا تھا وہ حاضر تو تھے مگر ہنسی خوشی سے تقریب منانے کی بجائے عام طور پر وہ چہ میگوئیاں کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ لڑکے کے ماں باپ اتنے غمزہ کیوں ہیں؟ لڑکا تو ابھی کالج میں پڑھ رہا ہے اور کوئی روزگار بھی نہیں ہے! وغیرہ وغیرہ۔ میرے لئے اُن لوگوں کی ایسی باتیں سننا کافی مشکل تھا جو کہ ایک کے منہ سے نکل کر دوسرے کے کانوں تک جا رہی تھیں۔ مجھے تو لوگوں کا گپیوں ہانکنا اور چہ میگوئیاں کرنا نہ اُس وقت پسند تھا اور نہ اس وقت۔ اب جو میں اُس دن کے متعلق

سوچتا ہوں تو خوشی کی کوئی بات بھی ذہن میں نہیں آتی۔ اور سب سے افسوسناک بات یہ تھی کہ شادی کے دن ہماری کوئی تصویر بھی نہ لی گئی! کسی پیشہ ور فوٹو گرافر کو نہیں بلایا گیا تھا۔ حالانکہ میرے والد کا ایک دوست بہت اچھا فوٹو گرافر تھا۔ اب میرے پاس اپنے بچوں اور آگے اُن کے بچوں کو دکھانے کے لئے ایک بھی تصویر نہیں ہے۔ یہ میری بڑی حسرت ہے کہ کاش کسی نے ہماری شادی کے موقع پر کوئی تصویر اُتاری ہوتی تاکہ لوگ دیکھ سکتے کہ اُس دن میں اور بُشری کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ ہاں ہم خوش تو نہیں تھے مگر دونوں اپنے عین شباب کے عالم میں تھے۔ بس مجھے یہی خواہش رہتی ہے کہ اُس دن کی یادداشت کے طور پر ہمارے پاس چند تصاویر ہوتیں۔ مگر صد افسوس کہ شادی کے موقع پر کوئی تصویر بھی نہ اُتاری گئی۔ صرف میرے ذہن میں یادوں کی تصاویر محفوظ ہیں۔ پاکستان میں ہونے والی شادیوں کی تاریخ میں میری اور بُشری کی تنہا شادی ہے کہ جس کی کوئی تصویر نہیں۔

میرا دل تو بہت چاہتا ہے کہ میں بُشری سے بھی ہماری شادی کے متعلق سے باتیں پوچھوں، مگر حافظہ کمزور ہونے کی بیماری کی وجہ سے اُس کی یادداشت میں فرق آ گیا ہے اور اُسے کچھ بھی یاد نہیں۔ صرف مجھے اور چند قریبی رشتہ داروں اور میری چھوٹی بہن سیمہ کو ہماری شادی یاد ہے۔

شادی کے روز میں نے جان بوجھ کر خالوصالح کو نظر انداز کئے رکھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اُنہوں ہی نے میرے والد کو یہ شادی کروانے کے فیصلہ پر مجبور کیا تھا۔ لیکن بعد

میں مجھے یہ حقیقت سمجھ آنا شروع ہو گئی کہ ایک باپ کو کس قدر دکھ محسوس ہوتا ہے جب اُس پر کوئی ایسی غیر متوقع افتاد آ پڑتی ہے۔

میرے والد اُس بات کو شہرت دیئے بغیر جلدی اور خاموشی سے نبھانا چاہتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے خود ساختہ دردِ سر کو ختم کر کے اپنی روزمرہ کی زندگی کو دوبارہ آزادانہ طور پر شروع کرنا چاہتے تھے۔

شادی کے بعد 1972 کی گرمیوں کے ایام میں بُشریٰ اور میں فریڈ ٹاؤن ساہیوال کے ایک دست شناس (پامسٹ) جسکا نام ساجد تھا کے پاس گئے جو کہ اُن دنوں بہت مشہور و معروف تھا اور جسکا دعویٰ تھا کہ وہ ہتھیلی کی لکیریں پڑھ کر قسمت میں لکھے ہوئے آئندہ آنے والے حالات بتا سکتا ہے۔ اُس نے پہلے میری ہتھیلی کی لکیریں پڑھیں اور بتایا کہ میرا مستقبل بڑا روشن ہے اور میری زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ اُس کے بعد اُس نے بُشریٰ کا ہاتھ دیکھ کر اُسے بتایا کہ وہ بہت جلد کینیڈا چلی جائے گی اور اُس کے ہاتھ کی لکیریں بہت خوش قسمتی کی نشاندہی کر رہی ہیں، اُس کا مستقبل بہت اچھا ہوگا اور اس کا جواں عمر خاوند یونس ایک بہت امیر آدمی بن جائے گا۔

اُس کی اس بات پر میں قدرے حیران تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس وقت بُشریٰ میرے ہمراہ کینیڈا جائے۔ لیکن پامسٹ کی تمام پیش گوئیاں میری زندگی میں سچی ثابت ہوئیں۔



ایک چھت کے تلے جداگانہ زندگیاں

امریکی مزاحیہ اداکار ہنری ٹینگمین جب یہ کہا کرتا تھا:
”مجھے میری بیوی سے بچاؤ!“

تو اُس کے سامعین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کی ہنسی اغلباً مناسب حال ہو، کیونکہ بہترین حالات میں بھی شادی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ چاہے آپ کو اپنی بیوی سے کتنا ہی پیار ہو، پھر بھی مشکلات دامن گیر رہتی ہیں۔ ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے اپنے سسرال سے نبھانا یا بچوں کو پالنا، گھریلو اخراجات پر نظر رکھنا، یا زندگی کے کسی بھی مسئلہ سے نبرد آزما ہونا اتنا آسان نہیں کہ میاں بیوی دونوں ہر بات پر متفق ہوں۔

شروع ایام میں مجھے اپنی بیوی میں کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے اُسکی خاطر ہر روز بلا ناغہ گھر آنا میرے لیے تکلیف دہ بات تھی۔ شادی کے بعد کئی ماہ تک بُشری سے واقفیت پیدا کرنے کی میں نے کوئی کوشش نہ کی۔ اُس وقت میں نو عمر تھا اور کسی قسم کے ہنی مون پر جانا میری سمجھ سے بالا تھا۔ عام طور پر تو شادی شدہ نئے جوڑے ایک

دوسرے سے پیار کا اظہار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے ہر دم بیتاب رہتے ہیں اور آپس میں گھل مل کر اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ مگر ہم دونوں ان تمام باتوں سے مُبرا تھے۔ نہ ہی بُشریٰ شام پڑنے پر میرا کوئی پسندیدہ کھانا تیار کر کے میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ باہمی قُرب و شناسائی کی خاطر ہم نے کبھی بھی ایک دوسرے کو اپنے دل کی باتیں، اپنی خواہشات اور سہانے خواب نہ سنائے تھے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا مجھے تمام عمر افسوس رہا ہے۔

میں چاہتا تھا کہ میری شادی کسی ایسی جگہ ہوتی کہ میں اپنی بیوی کے سامنے اپنے دلی جذبات اور خیالات کا اظہار کر سکتا۔ کوئی کاروبار شروع کرنا، ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک جانا، پھر اُس سے آگے کسی اور ملک چلے جانا، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کا ذہن پر کافی بوجھ رہتا ہے۔ مگر کوئی نہ تھا جس سے میں ان تمام امور کے متعلق گفتگو کر سکتا اور مشورہ لیتا۔

یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ میری عمر صرف انیس سال کی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا میری جواں عمری مجھ سے چھین لی جا رہی ہے۔ جس لڑکی سے میری شادی زبردستی کروادی گئی تھی وہ مجھ سے عمر میں چار سال بڑی تھی اور اُس کو بھی مجھ سے شادی کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُس وقت ہم دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو پسند نہ کرتا تھا، اور یہ ایک انتہائی تکلیف دہ حالت تھی۔ لیکن اب جو میں اُن ایام پر نظر دوڑاتا ہوں تو یہی سمجھ آتا ہے کہ جو کچھ بھی ہم پر گزر رہی تھی اُس

کے پیچھے ایک گہری حکمت کا فرما تھی۔

میری شادی ہو جانے کے چند مہینوں کے بعد عزیز کینیڈا سے واپس پاکستان آ گیا، اور اُس نے یہاں ایک مشہور مقامی گھرانے کی ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لی۔ اُس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور خوب خوشیاں منائی گئیں۔ بہت سے فوٹو گرافر بلائے گئے۔ جنہوں نے ڈھیروں تصویروں اُتاری۔

میری بھابھی ایک سلیقہ شعار، شائستہ، ہنس مکھ اور ذہین خاتون ہے۔ عمر بھر اس کے ساتھ میرا بہت اچھا نبھاؤ رہا ہے۔ زندگی میں بھی دلچسپ اور عجیب موڑ آتے ہیں جو کہ آخر کار ہمیں اپنی منزل مقصود کی جانب لے جانے کا زینہ بن جاتے ہیں۔

میں 1971 کے آخر میں تازہ تازہ پاکستان آرمی اکیڈمی کاکول میں آفیسر ٹریننگ کے لیے بھرتی ہوا تھا اس لئے عزیز کی شادی پر نہ آ سکا۔ عزیز کے ساتھ بچپن میں میرا تعلق قدرے کشیدہ رہا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری باہمی دُوری ختم ہوتی چلی گئی۔ وہ ایک اچھا بھائی ہے اور اُس سے بڑھ کر وہ ایک اچھا دوست ہے۔

شروع ہی سے میرے اور بُشریٰ کے باہمی تعلقات کچھ ایسے نہ تھے جیسے کہ میاں بیوی کے ہونے چاہئیں۔ میں صبح اُٹھتا اور کالج چلا جاتا اور دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہتا۔ جب دل چاہتا واپس گھر آ جاتا۔ میں خود پر بُشریٰ کے متعلق کوئی ذمہ داری محسوس نہ کرتا کیونکہ میرے خیال میں اُس نے مجھے پھانس لیا تھا۔ اُس کا اپنا بھی زیادہ وقت کھانا پکانے اور گھر کی صفائی وغیرہ کرنے میں گزر جاتا۔ میرے

والدین کو بھی ہماری کوئی پرواہ نہ تھی۔ نہ کبھی کسی نے کوئی نصیحت کی اور نہ ہی شادی کے تعلق سے صلاح مشورہ دیا جس کا کہ اُن دنوں کوئی رواج بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی بُشریٰ یہ شکوہ بھی کرتی کہ اُسکے ساتھ میری والدہ کا رُو یہ دوستانہ نہیں۔ مگر میں سُنی اُن سُنی کر دیتا کہ جیسے یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی۔ ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے اور اپنے خاندانوں کے خلاف تلخی اور آزر دگی کے جذبات تھے۔

کبھی کبھی بُشریٰ اپنی ضد پر بھی اڑ جایا کرتی کیوں کہ شروع کے اُن ایام میں اُس کے دل و دماغ آزر دگی، غم اور جذبہ انتقام سے پُر رہتے تھے۔ غصے میں ہم ایک دوسرے کو دھکے بھی مار لیتے، اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتے اور دونوں کے درمیان نفاق پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

ایک میری یہ بھی خواہش تھی کہ بُشریٰ انگریزی سیکھ لے اور مجھ پر انحصار کئے بغیر خود اپنے طور پر مغربی معاشرہ میں گھل مل جائے۔ لیکن اُس کے خیال میں انگریزی سیکھنا ضروری نہ تھا۔ شروع کے ایام میں بُشریٰ کا رُحمان منفی رہتا اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلد رنجیدہ ہو جایا کرتی تھی۔ البتہ وہ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی، لیکن سختی بھی کرتی اور کسی کو اپنی نافرمانی نہ کرنے دیتی۔ جب ہمارے بچے بڑی عمروں کے ہو گئے اور وہ خود بھی والدین بن گئے اُس وقت بھی وہ اپنی والدہ کی نافرمانی کرنے سے سخت گھبراتے تھے۔ میرے خیال میں میری طبیعت اُس کے برعکس تھی۔ میں نرم مزاج تھا اور دوسروں کے کام میں خواہ مخواہ دخل اندازی کا میلان مجھ میں نہ تھا۔

جیسے کہ پہلے لکھ آیا ہوں شروع سالوں میں ہم دونوں ہی اپنی شادی پر خوش نہ تھے، نہ صرف مجھے اپنی بے فکر نو جوانی کے کھوجانے کا غم تھا، بلکہ یہ خوف بھی دامنگیر رہتا تھا کہ مجھے اپنی بقیہ تمام عمر اُس کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔ بالکل اسی طرح بُشریٰ کے غم و حزن کے جذبات اور خیالات کا میرے خلاف اظہار ہوتا رہتا تھا۔ خصوصاً شادی کے ابتدائی سالوں میں۔

اُس دوران میں نے کئی بار یہ کوشش بھی کی کہ کسی طرح خاموشی سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ 1970 کے درمیانی سالوں میں ایک دفعہ میں اُسے پاکستان میں اُسکے والدین کے پاس چھوڑ بھی آیا کہ وہ وہیں رہے، مگر وہ ایسی علیحدگی پر ہرگز رضامند نہ تھی۔ وہ مجھے کہا کرتی:

”میں مرجاؤں گی مگر تمہیں کبھی نہ چھوڑوں گی اور نہ ہی تمہیں ایسا کرنے دوں گی کہ تم مجھے چھوڑ دو۔“

شادی کے پہلے چار سالوں میں ہماری کوئی اولاد نہ تھی۔ 1975 میں بُشریٰ نے ہمارے پہلے بچے کو جنم دیا، یعنی صادیہ کو جو کہ ہمارے لیے خوشیوں کا خزانہ اپنے ساتھ لے آئی۔ صادیہ کی پیدائش کے وقت میری عمر صرف بائیس برس کی تھی۔ میرے دل و دماغ میں ابھی تک الجھے ہوئے اور متضاد جذبات کا فرما تھے، مگر پھر بھی ایک بچے کی پیدائش پر ہم ایک کنبہ بن چکے تھے۔ اس لئے ایک دوسرے کو چھوڑنا مزید مشکل ہو گیا۔ پھر ہمارے بیٹے بابر کی پیدائش کے بعد تو مجھ میں بالکل یہ سکت

نہ رہی کہ میں بشری کو طلاق دینے کا سوچ سکوں۔ اُس وقت میری عمر چوبیس سال ہو چکی تھی۔

میں ہر وقت خود سے یہ پوچھتا رہتا کہ میں اپنے دو بچوں کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟ بشری اکیلی دو بچوں کو کیسے پالے گی؟ ان باتوں کی بناء پر میرا دل اس بات پر بالکل آمادہ نہ ہوتا تھا کہ میں اُس کو طلاق دے دوں۔ میں دماغی طور پر کسی ایسی سوچ کا متلاشی تھا جو کہ مجھے صلح مندی کے ساتھ اُس زندگی کو قبول کرنے کی توفیق دے کہ جو مجھ پر جبراً لاگو کر دی گئی تھی۔ اور کسی ایسی سوچ کا مل جانا ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔

اُن ایام میں بھی میں کئی کئی دن بلکہ مہینوں تک نفرت، خوف، تاسف اور غم کا شکار رہتا۔ میری اس حالت کو دور کرنے میں بشری اور بچے بھی کچھ نہ کر سکتے تھے، کیونکہ بشری بھی تو مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہ تھی۔ پس ہم ایک بار پھر سے کسی اور کے لکھے ہوئے ڈرامے میں محض اداکاری کا رول ادا کر رہے تھے۔

حالات چاہے جیسے بھی ہوں، شادی نبھانا کوئی آسان کام نہیں۔ دو افراد جو ایک ہی چھت تلے رہتے ہوں اور مذہبی حدود کی پابندی کے ساتھ رسم و رواج کے ماتحت اولاد پیدا کرتے ہوں، وہ منشاء الہی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

ایک گھر بسا نامعاشرے کی بنیادی اینٹ ہے، اس لئے گھرانے کی حفاظت کرنا اور اُسے پروان چڑھانا بے حد ضروری ہے۔ اپنی شادی کے شروع کے ایام میرے لئے کافی گراں بار تھے مگر اُس کے باوجود میں شادی کے جوڑ کے تقدس کا قائل

رہا ہوں۔ اور اسی لئے جب میرے اپنے بچوں کی شادیوں اور اُن کے اپنے اپنے گھر بسانے کا وقت آیا تو میں نے ہمیشہ اُنکا ساتھ دیا۔ میں نے انہیں پیار دیا اور اپنی دانست کے مطابق اُن کی راہنمائی کرتا رہا۔ میں نے اُن کو جو بھی مشورے دیئے اُن کا نچوڑ یہ تین باتیں ہیں: ہم آہنگی، مصالحت اور جذبہ۔

اپنی جواں عمری میں جب میں پاکستان میں رہتا تھا۔ اُس وقت سے لیکر اب تک دنیا کافی بدل چکی ہے۔ بعض تغیرات تو قدرے پریشان کن ہیں۔ مگر اکثر تبدیلیاں خوش گُن ہیں۔ خصوصی طور پر جن کا تعلق حقوق نسواں سے ہے۔ مجھے مُسرت ہے کہ ہم اب خواتین کی تعلیم پر زور دے رہے ہیں اور انہیں ایسے مواقع حاصل ہیں کہ وہ خود اپنے حقوق کے بارہ میں اور جو مسائل انہیں درپیش ہیں، اپنی آواز بلند کر سکتی ہیں۔

یہ تو واضح ہے کہ مغرب و مشرق میں ابھی تک خواتین کو برابر کا تحفظ اور ترقی کے یکساں مواقع حاصل نہیں ہیں اور خواتین کی بہت سی تحریکات سے ظاہر ہے کہ ابھی اُنکی خیر خواہی اور معاشرہ میں حفاظت کی منزل کافی دُور ہے۔ اس لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ خواتین اپنی شادی ہو جانے کے بعد بھی محفوظ رہیں۔ جس کا بہترین طریق یہ ہے کہ وہ اور اُن کے زندگی کے ساتھی دونوں ہم کفو اور ہم آہنگ ہوں۔

ہمیں بچپن ہی سے یہ یقین دہانی کرائی جاتی تھی کہ شادی بیاہ کے معاملہ میں والدین صحیح فیصلہ کرتے ہیں۔ اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ میں بھی اپنے بچوں کے لئے مناسب رشتے تلاش کرنے میں شامل رہا ہوں۔ مجھے اپنے بچوں کے

مزاج، مخصوص عادات اور خطوں کا بھی علم تھا اس لئے ضروری تھا کہ اُن کو جیون بھر کے ایسے ساتھی ملیں جو اُن کے ساتھ گھل مل کر رہ سکیں، ان کے طور طریقوں، عادتوں کو سمجھتے ہوئے ان کے مزاج اُٹھا سکیں۔

اگر اُن کی طبیعتیں اتنی مختلف ہوں کہ باہمی نباہ نہ کر سکیں، ایک دوسرے سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہ ہو سکیں تو پھر وہ زندگی میں دیگر اہم فیصلے کس طرح کر پائیں گے! مثلاً بچوں کو پالنا، گھر خریدنا وغیرہ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حقیقی طور پر خوش و خرم کیسے رہ سکیں گے! علاوہ ازیں میں اپنے گھرانے کے عزت و وقار قائم رکھنے کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے بچوں کے رشتے ایسے گھرانوں میں ہوں جو کہ معزز اور مضبوط ہوں۔ کیونکہ انہوں نے ہمارے گھرانے کے ساتھ منسلک ہو کر ایک ہی خاندان بن جانا تھا۔

دو طبیعتوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے مگر اس سے تمام مسائل حل نہیں ہو جاتے۔ شادی ہو جانے کے بعد باہمی افہام و تفہیم کی اہلیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ آپ ایک تاجر سے پوچھیں کہ جس نے گفت و شنید کے ذریعہ بے شمار سودے طے کئے ہوں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ باہمی مصالحت کافی مشکل کام ہے۔ بیوپار اور شادی ہر دو میں یہ لازمی ہے کہ گفت و شنید میں کچھ باتیں مانی جائیں اور کچھ منوائی جائیں۔

کامیابی کے لیے یہ سمجھوتہ کرنے کی اہلیت ایک لازمی جُز ہے۔ جہاں تک میرے

اپنے کاروبار میں یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا تعلق ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے اندھا دھند کام کرنا، اخراجات پر نگاہ رکھنا اور بیوپار کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور بشریٰ نے بھی کبھی مجھے اپنا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کرنے پر زور نہیں دیا۔ میں ہمیشہ اپنے بچوں کو یہی نصیحت کرتا ہوں کہ ایک دوسرے کی بات مانیں اور مصالحت سے رہنا سیکھیں۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ایک کامیاب شادی کے لئے جذبات سے پرہیز بھی تعلقات لازمی ہیں۔ مضبوط جذباتی تعلقات تمام زندگی کے لئے ضروری ہیں چاہے کوئی مشغلہ ہو، یا منزل مقصود تک پہنچنا ہو، یا میری طرح کام کرنے کا جنون۔ دلی جذبہ انسان کو آگے سے آگے لے جانے کے لئے جُز و لازم ہے اور بھرپور زندگی گزارنے کا معاون و مددگار کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر یہی جذبہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں رچ بس جاتا ہے۔ یہ جذبہ ہی تھا جس نے مجھے پاکستان سے باہر جانے پر آمادہ کیا، ایڈمنٹن کی بخ بستہ فضاؤں میں قوت برداشت دی اور کینساس کے وسیع میدانوں میں اپنے ذمہ کام لینے کے لئے تیار کیا۔

نئے ہنر سیکھنے کا یہ جذبہ ہی تھا جس نے مجھے براہ راست خرید و فروخت کرنے اور پھرتیل اور گیس کے بیوپار کی راہ پر چلایا۔ علاوہ ازیں، اسی نے مجھے ہر روز صبح سویرے اٹھ کر غیر معمولی تجسس کے ساتھ کام کرنے میں لگن رکھا۔ پس یہ جذبہ ایک خوشحال شادی کے لئے کیوں ضروری ہے؟

اکثر ہم شادی کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بُشریٰ بھی اپنے حالات کے تحت ایسی غلطی کا شکار تھی۔ میں باہر کام پر جاتا اور وہ تمام دن گھر میں رہتی۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ انگریزی بول چال سیکھ لے اور گھر کے کام کاج سے ہٹ کر کسی دوسرے کام میں بھی خود کو مصروف رکھے۔ مثلاً گھریلو اخراجات کا حساب کتاب رکھے، بل ادا کرے، چیک لکھے۔ یعنی کوئی بھی اضافی کام جو اُس کی اہمیت کو تقویت دے، اُسکو کرنا سیکھے۔ لیکن اُس کو ایسے کام کاج میں بظاہر کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہ ایک بد قسمتی تھی۔ اگر وہ ایک جوش و جذبہ کے تحت اپنے آپ کو مصروف رکھتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اس بیماری میں مبتلا نہ ہوتی جس کا اب اُسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

پاکستان چھوڑنے کے بعد کئی دفعہ میں نے اُسکو اُستاد اور اتالیق انگریزی سکھانے کے لئے رکھ کر دیئے۔ لیکن اس میں اُسکو قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہیوسٹن میں میں نے اس کے لئے ایک بہترین اُستانی ڈھونڈی۔ بُشریٰ اُس سے ملتی اور اُس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی اور فروخت ہونے والی چیزوں کے رسالے اور تصاویر دیکھتی مگر اُس اُستانی سے اُس نے کچھ بھی نہ سیکھا! پھر میں نے چھوٹی عمر کی ایک طالب علم لڑکی کو ڈھونڈا جو کہ آکر اُس کے ساتھ انگریزی میں بات چیت کرے۔ بُشریٰ اُس لڑکی سے بہت پیار سے ملتی اور ہمیشہ بہت اچھا سلوک کرتی۔ لیکن اُس کے ساتھ باتیں اپنی ہی زبان، یعنی اُردو میں کرتی۔ یہ کوشش میں نے کئی بار کی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیونکہ اُس کو انگریزی سیکھنے میں ذرا سی بھی دلچسپی نہ تھی۔ کاش، اُس میں ایک شوق و جذبہ ہوتا جس کے ماتحت وہ

آگے بڑھتی، جیسے کہ مجھ میں ایک جذبہ کارفرما تھا۔ گھر میں یونہی بغیر کسی کام کے بیٹھے رہنا زندگی گزارنے کا طریق نہیں ہے اور اُس سے زیادہ بڑھ کر یہ طرز زندگی شادی میں ایک اچھا شریک حیات بننے میں بھی کچھ مدد نہیں دیتا۔ اگر وہ گھر سے باہر نکل کر کسی کام کاج میں مصروف ہو جاتی تو اُس نے بہت کچھ سیکھ جانا تھا۔ اُسے اگر کوئی جذباتی دلچسپی تھی تو بس اچھے قیمتی کپڑے اور زیورات خریدنے میں تھی۔ خصوصاً اپنی موجودہ بیماری سے دودھائیاں قبل کے زمانے میں۔

اپنے معاشرے میں مجھے آج بھی کئی خواتین ایسی نظر آتی ہیں جو غمزدہ ہیں اور پرانے وقتوں کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ میں اُنکی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہوں کہ وہ اپنی پسند کا کوئی کام ڈھونڈیں اور جو کچھ بھی وہ اپنی زندگی میں کرنا چاہتی ہیں، اُس کے حصول کے لئے ایک جوش و جذبے کے ساتھ لگن ہو جائیں۔ پھر میں ہر ایک کا حوصلہ بڑھاتا ہوں جو کسی بھی نسل، طبقہ یا جنس سے ہو اور تلقین کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا کام شروع کرنے کی جستجو کرے جو کہ اُسے پسند ہو اور جس میں وہ اشتیاق اور انہماک کے ساتھ مصروف رہے۔

ہماری ایک ہی تو زندگی ہے اور ہمارے پاس خدا کے عطا کردہ بے شمار وسائل موجود ہیں۔ میں نے تو یہی سبق سیکھا ہے کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ مثبت رجحان رہنا چاہیے اور ایک اُبھرتے ہوئے جذبہ کے ساتھ کام کرتے چلے جانا چاہیے۔ علاوہ ازیں، پاکستان کے دیہی علاقوں اور دُنیا کے بہت سے حصوں میں

بکثرت ایسی لڑکیاں ہیں جن کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُن کو تعلیم حاصل کرنے میں مدد دیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ اپنی خداداد قابلیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ ہمیں دوسروں کو ترقی کی راہ پر چلانے کی خاطر اپنے کمائے ہوئے مال میں سے خرچ کرنا چاہیے۔

گذشتہ دنوں میں نے ایک لڑکی خالدہ بروہی کی کہانی سنی جس کی ایک خالہ زاد بہن کو خاندان کی عزت کی بحالی کے لئے قتل کر دیا گیا تھا۔ خالدہ کو اپنی خالہ زاد بہن سے بہت پیار تھا اور اُسے یہ بات بالکل سمجھ نہ آئی کہ اُس کی جان کس لئے بھی کسی اور کے لکھے ہوئے ڈرامہ کے اداکار تھے۔ خالدہ کی کہانی بے حد پُر درد ہے۔ مگر اُس نے حوصلہ نہ ہارا اور کوشش کرتی رہی یہاں تک کہ اُس نے اپنا مقصد پالیا۔ پھر اُس نے ایک بہت ہر دلعزیز کتاب ”میں قابلِ احترام ہوں“ لکھی۔ دو قہوہ خانے کھولے، ایک نیویارک میں اور دوسرا ایریزونا میں اور ایک ڈرامہ جو کہ اُس نے خود لکھا، اُس میں تنہا اداکار عورت کا رول بھی ادا کرتی ہے۔

خالدہ کی کہانی اس بات کی ایک اچھی مثال ہے کہ یکسوئی اور جذبے کے ساتھ کام کرنا نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ جذبہ ایک مقصد عطا کرتا ہے، قوت بخشتا ہے۔ آگے بڑھاتا ہے، باہمی تعلقات کو بہتر بناتا ہے اور دلی خوشی اور صحت برقرار رکھنے میں مُمد بن جاتا ہے۔

ہماری شادی کے پہلے پانچ سال خراب گزرے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف

غصے اور انتقام سے پُر تھے۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدلنا شروع ہو گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ بُشریٰ کی سادہ مزاجی، سخاوت اور ہمدردی نکھر کر سامنے آنا شروع ہو گئی۔ اُسکی چھوٹی بہن بلقیس کو یاد ہے کہ جب وہ بڑی ہو رہی تھی تو بُشریٰ اُس سے کتنا پیار کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی:

”جو کچھ بھی میری اپنی والدہ نے کرنا تھا وہی سب کچھ میری بہن بُشریٰ کیا کرتی تھی اور مجھے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھی۔“
بلقیس کہا کرتی تھی کہ اُسے اس کا سبب معلوم نہیں۔

ایک دفعہ بُشریٰ بلقیس کو ساتھ لیکر بازار سے کچھ سودا خریدنے کے لئے گئی تو اُس دوکاندار لڑکی پر پڑی جو اُداس نظر آرہی تھی۔ بُشریٰ کو خیال آیا کہ شاید اُس کے پاس پیسے نہیں ہیں، اور بُشریٰ نے بڑی دلکشادگی سے اُس لڑکی کو کچھ نقد رقم دے دی۔ اس پر بلقیس نے بُشریٰ کو ایک طرف لیجا کر پوچھا:

”باجی! آپ یہ کیوں کر رہی ہیں؟“

کوئی جواب دینے کی بجائے بُشریٰ نے بلقیس کو دکان سے باہر انتظار کرنے کو کہا اور خود دوبارہ اندر جا کر اُس لڑکی کو مزید رقم دے آئی۔

زندگی کی مسافرت کے دوران خود میں نے بھی بُشریٰ کی وسعتِ قلبی کے نظارے کئے ہیں۔ اشیاءِ فروخت کرنے والی لڑکیاں اور دوسرے لوگ جو کہ ہمیں جانتے تھے

درجنوں کے حساب سے اُس کے پاس آنا شروع ہو جاتے۔ بُشریٰ اتنی سادہ دل تھی کہ اُسے بالکل پتہ نہ چلتا کہ بعض لوگ اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ حالانکہ مجھے واضح طور پر یہ بات سمجھ آ رہی ہوتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اُن کو کثرت سے معاوضہ ملے گا۔ سادگی اور سخاوت کی خوبیاں بُشریٰ کی شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھیں۔ اگر اُس کو پتہ چلتا کہ قریبی رشتہ داروں میں سے کسی کو امداد کی ضرورت ہے تو وہ فوراً پوری کوشش کر کے اُس کی مدد کر دیا کرتی تھی۔

بُشریٰ بے حد مہمان نواز بھی تھی۔ اگر اُسکی ملاقات کسی انجانے سے ہو جاتی، خصوصاً اگر وہ پُرساں حال ہوتا تو اُسے ہمارے گھر دعوت پر بلا لیا کرتی تھی:

”ہمارے گھر آئیے! میں آپ کے لئے چائے بناؤں گی اور دوپہر یا رات کا کھانا بھی اکٹھے کھائیں گے!“

خصوصاً اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ تو اس کا پیار و محبت کا رشتہ بے حد مضبوط تھا، جس کا اظہار تمام عمر ہوتا رہا۔ اُس کے قریبی دوست بھی وہی ہوتے جو کہ کسی تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہوں، بہ نسبت اُن کے کہ جن کا تعلق اُنچے امیر گھرانوں سے ہوتا اور جنہیں کسی قسم کے سہارے کی ضرورت نہ ہوتی۔

مجھے یہ بھی احساس تھا کہ بُشریٰ ہمارے اپنے بچوں کی نسبت جب کہ وہ سب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے، اپنے بھائی بہنوں اور غیروں کے ساتھ زیادہ نرم دل تھی۔ بُشریٰ اپنے چاروں بچوں سے بہت ہی پیار کرنے والی ماں تھی، مگر وہ اُن پر کڑی نگاہ بھی

رکھتی تھی تاکہ مروجہ دستور کے مطابق اُن کی پرورش اُسی طور سے ہو جس طرح پاکستان میں خود اُس کی اپنی ہوئی تھی۔ بُشریٰ نے بہت سی قربانیاں دیں اور اپنا تمام وقت اپنے بچوں کی تربیت پر لگایا تاکہ وہ اچھے انسان بن کر اُبھریں۔

بُشریٰ اپنے بچوں کی محبت میں گرفتار تھی اور اس کی صحت مندانہ عمر کا سارا حصہ اپنے بچوں کے گرد گھومتا رہا۔ درحقیقت ہمارا چھوٹا بیٹا یوسف اُس کے لئے ہمیشہ ایک ننھا سا بچہ ہی رہا ہے اور ابھی بھی جب کہ میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں اُس کے ذہن میں وہ ایک بچہ ہی ہے۔

ہماری بیٹیاں جب اسکول اور کالج سے واپس گھر آتیں تو آتے ہی پاکستانی لباس پہن لیا کرتی تھیں۔ اُن کو اُردو بول چال بھی سیکھنا پڑی۔ اُن کی شادی کروانے میں میرا اور بُشریٰ کا کافی ہاتھ تھا۔

بُشریٰ کی خواہش تھی کہ اُن کی شادیاں جلدی ہو جائیں تاکہ وہ عین جوانی میں اپنے اپنے گھر بسانے والیاں ہوں اور زندگی کے اُن لمحات سے لطف اندوز رہیں۔ ہماری سب سے بڑی بیٹی کی شادی کے وقت اس کی عمر 19 سال تھی۔ شادی خاندانوں، رسم و رواج اور بنیادی استحکام میں اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہم جب اپنے بچوں کے لئے مناسب رشتوں کی تلاش میں تھے تو ہم اُمیدواروں کے خاندانی نسب، اہل خانہ کے باہمی تعلقات اور انداز پرورش کے پس منظر کو بہ نظر غور دیکھ لیا کرتے تھے۔

مجھے اُمید ہے کہ آئندہ آنے والے سالوں میں ہماری اولاد اور اولاد در اولاد خاندانی نسب کا خاص خیال رکھے گی اور وہ اپنے بچوں کی شادیاں خدا سے پیار کا تعلق رکھنے والے گھرانوں میں کریں گی۔ مثال کے طور پر ذرا اس طرح سوچئے:

جب کسی کو ملازمت دینی ہو تو درخواست کنندہ کو سب سے پہلے مختلف تحریری اور پیشہ وارانہ امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کام کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو تو پھر بھی اُس کے گزشتہ ریکارڈ کو بڑی احتیاط سے پرکھا جاتا ہے اور تصدیق کروائی جاتی ہے کہ اس سے پہلے اس نے جن جگہوں پر کام کیا تھا وہاں وہ کتنا قابلِ اعتماد، دیانت دار اور دل لگا کر کام کرنے والا تھا۔ ان تمام امور کا پتہ لگانے کے دوران اگر پس منظر میں کہیں کوئی معمولی سا نقص بھی نظر آجائے تو ایسے اُمیدوار کو نئی ملازمت دینے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب آپ اپنی تمام زندگی کے لئے ایک ساتھی کا انتخاب کر رہے ہوں تو ضروری ہے کہ پوری تحقیق کے ساتھ اس کا خاندانی پس منظر، گزشتہ واقعات اور نسب و نسل کو دیکھ لیا جائے۔ بلاشبہ یہ میری ذاتی سوچ ہے اور میرے علم میں ہے کہ ایسے کئی لوگ ہیں جو کہ پہلی نظر ہی میں فوری طور پر باہمی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ کوئی تحقیق نہیں کی، شادی کر لی۔ اور اُسکے بعد ساری عمر خوشی خوشی گزار دی۔

جیسے جیسے ہمارا گھرانہ بڑا ہوتا گیا، بُشریٰ کی خواہش تھی کہ پاکستانی رواج کی طرح ہمارے تمام بچے ہمارے ساتھ ہی رہیں۔ اس لئے ہم نے اپنا مکان وسیع کرنے کے لئے اس سے پوسٹہ دوسری رہائش گاہیں بنوالیں جن میں باورچی خانے اور مہمان خانے

سب کچھ تھے اور ہمارے تمام بچے اور اُنکے گھرانے سب مل کر ایک وسیع مکان کی حدود کے اندر ہی پاس پاس رہنے لگے۔ آج ہمارا وسیع مکان تمام ساز و سامان سے پُر ہے، لیکن بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔

بُشریٰ پارکنسن بیماری میں مبتلا ہے اور میرے ساتھ ایک الگ مکان میں رہتی ہے جو کہ ہوسٹن گلو ریا کے علاقہ میں ہے۔ ہمارے سارے بچے گھونسلے سے باہر جا چکے ہیں، مگر وہ سب ہمارے قریب ہی رہتے ہیں اور جب بھی ممکن ہو ملنے کی خاطر آ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک بڑے گھر میں سب کا ساتھ مل کر رہنا جیسے کہ ہم پروان چڑھے تھے، یہاں امریکہ میں قابل عمل نہیں ہے۔

میں نے زندگی میں یہ اہم سبق سیکھا ہے کہ بچوں کو آزادی اور خود مختاری دینی چاہیے تاکہ وہ خود اپنی اپنی منزل تعین کریں۔ والدین کا کام ہے کہ اپنے بچوں کو اخلاق، تعلیم، گفتگو اور کام کرنے کا سلیقہ اور کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ سکھانے کے بعد جب وہ تیار ہو جائیں تو انہیں اپنا اپنا گھونسلہ بنانے دیں۔ یہ ہی میری تمام زندگی کے تجربات سے حاصل کردہ اہم سبق ہے۔

میں امریکہ میں رہنے والی نوجوان نسل کو تلقین و تحریک کرونگا کہ وہ عمر رسیدہ لوگوں اور بیماروں کا خیال رکھنے کے لئے ضرور وقت نکالیں۔ بچوں کو بھی ویسے ہی کرنا چاہیے جیسا کہ اُن کے والدین نے ان کے ساتھ پیار و محبت کا سلوک جاری رکھا تھا اور اس طرح ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہے گا۔ امریکہ میں ہمیں بوڑھوں اور بیماروں

کی دلجوئی کے لئے جو کہ یہاں بے بس اور تنہا زندگی بسر کر رہے ہیں، ہر دم تیار رہنا چاہیے۔ اور اپنے اوقات، جذبات، محبت اور احترام انکی خدمت کے لئے پیش کرتے رہنا چاہیے۔ انہیں ضرورت ہے کہ ہم اُن کو پیار و محبت کی صحبت دیں اور تیمارداری کے لئے وقت نکالیں۔



تیس ڈالرز اور ایک خواب

میں تھکاوٹ سے چور تھا اور یورپی کھانوں کی بومزید برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کینیڈا میں داخل ہوتے وقت ہم جب جہاز سے مانیٹریال کے ہوائی اڈہ پر اترے تو میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا:

”شکر ہے۔ آخر ہمارا سفر ختم ہوا!“

جہاز سے اتر کر انٹرپورٹ سے باہر نکلنے سے پہلے امیگریشن آفیسر کو پاسپورٹ دکھانے کے لئے ہم قطار میں کھڑے ہو گئے اور قطار آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ مجھے گھبراہٹ تھی کہ نہ جانے امیگریشن آفیسر کیا کیا پوچھے گا۔ اُس وقت میری جیب میں صرف تیس ڈالرز تھے اور میں اپنے گھر سے 6300 میل دُور آچکا تھا اور اپنے نئے ملک میں داخل ہونے کی راہ میں جو کہ میرے خوابوں کی دُنیا تھی، اب یہ آخری مرحلہ تھا۔

آفیسر نے ہم دونوں کے پاسپورٹ لے کر دیکھنے شروع کیے اور پوچھا:

”تمہارے ساتھ کتنے سوٹ کیس ہیں؟“

میں نے جواب دیا: ”جناب! چار سوٹ کیس۔“

اُس نے حیران ہو کر پوچھا:

”صرف چار سوٹ کیس! بس اتنا تھوڑا سامان ساتھ لائے ہو؟“

”جی جناب!“ میں نے جواباً عرض کیا۔

”کیا تمہارا کچھ سامان بعد میں بھی آرہا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم

پاکستان سے اپنے گھر کا تمام ساز و سامان، کرسی میزیں سب کچھ

اپنے ساتھ لا سکتے تھے؟“

اس نے مجھ سے پوچھا اور جواباً میں نے مثبت میں سر ہلا دیا۔

پھر اُس کی نظر میرے ویزے کی ایک تحریر پر پڑی اور اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے معلوم تھا کہ وہ تحریر کیا کہہ رہی تھی؟ یہ سُن کر میں قدرے پریشان ہونا شروع ہو گیا۔

”یہاں لکھا ہوا ہے کہ تم اپنی بیوی کے بغیر کینیڈا میں داخل نہیں

ہو سکتے!“

یہ کہہ کر اُس نے کبھی کبھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ صرف مزاحاً تنگ کر رہا تھا۔

اُسکی یہ بات سُن کر میں مُسکرا دیا اور آہستہ سے آرام کا سانس بھرا۔ پھر اُس نے ہم

دونوں کے پاسپورٹوں پر مہر لگا کر پاسپورٹ ہمیں واپس کر دیئے اور اُس نے فخریہ طور پر

زور سے کہا: ”کینیڈا میں خوش آمدید!“

”بہت شکریہ جناب!“ میں نے جواب میں کہا۔

اس طرح نومبر 1973ء میں کینیڈا نے ہمیں شفقت، ہنسی اور کشادہ دلی سے خوش آمدید کہا۔ دو سال قبل 1971ء میں میرے کینیڈا آنے کے خواب کی تخم ریزی ہو چکی تھی۔ میرے بھائی عزیز نے مجھے اور بشریٰ کو کینیڈا ہلانے کے لئے قانونی ذمہ داری کے طور پر پیشکش کی تھی۔ نقل مکانی سے قبل میں کینیڈا کی وسعتِ زمین، وہاں کے لوگوں اور تہذیب و ثقافت کے متعلق مطالعہ کرتا رہا اور اُس نے میرا دل جیت لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تخم ریزی گہری ہوتی چلی گئی اور میں بڑے بڑے خواب دیکھنے لگا۔

ابتداءً میرے ارادے بہت نیک تھے۔ میں نے سوچا کہ دولت کما کر پیسے واپس گھر بھیجا کروں گا تا کہ میرے والدین ایک آرام کی زندگی گزار سکیں اور ہم خود بھی دوبارہ پاکستان آجائیں گے۔ ہمیں الوداع کہنے کے لئے میرے والدین کے علاوہ رشتہ داروں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ بیس سے زیادہ افراد جمع ہو گئے تھے۔ میری چھوٹی بہن سیمہ، ماموں، خالو اور دیگر قریبی رشتہ دار، سب ہمارے گھر اور بعد میں ساہیوال ریلوے سٹیشن تک خدا حافظ کہنے کے لئے آگئے تھے۔

جونہی لاؤڈ سپیکر پر ٹرین کے چلنے کا اعلان ہوا، میری چھوٹی بہن سیمہ کی سسکیاں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور جب عوامی ایکسپریس ٹرین کراچی جانے کے لئے روانہ ہوئی شروع ہوئی تو اُس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور میری والدہ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے پر نم ہو گئیں۔

جدائی کا ماحول تو غمگین تھا مگر مجھے پاکستان سے باہر نکلنے کی خوشی بھی ہو رہی تھی۔

میں نے ٹرین کی کھڑکی پر لگی لوہے کی سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اور مُڑ کر سب کو دیکھا اور اپنے تمام خاندان اور اپنی جائے پیدائش کو الوداع کہا، جہاں کہ میں پل کر بڑا ہوا تھا۔ میری زندگی کے کئی دوسرے ایچھے بُرے واقعات کی طرح یہ بھی بولی وڈ فلموں کے مناظر کی طرح ایک منظر تھا۔

جب جہاز نے ہمارے سفر کی آخری منزل، کینیڈا کے شہر ایڈمنٹن کی جانب اترنا شروع کیا تو مجھے ایک بہت بڑے پھیلے ہوئے شہر کی جگمگاتی روشنیاں دُور دُور تک نظر آنا شروع ہوئیں۔ ہمارے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی سورج ڈوب چکا تھا۔ جب ہم باہر نکلے تو عزیز اور بھابھی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ سخت سردی تھی اور جب میں نے سانس باہر نکالا تو میرے مُنہ سے سفید دھواں برآمد ہوا جیسے کہ میں سیگریٹ پی رہا ہوں۔ زمین پر کئی انچ برف پڑی ہوئی تھی اور میرے پاکستانی جوتے اُس برف پر چلنے کے لئے نہیں بنے تھے۔ پھسلتے راستے پر جب ہم عزیز کی کار کی طرف جا رہے تھے تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سہارا دینے رکھا۔ آنے والے مہینوں میں عزیز اور میری بھابھی نے ہم دونوں کو متواتر سہارا دیا جب کہ حقیقتاً ہم ایک نئے ملک میں اپنے قدم جما رہے تھے۔

جب ہم عزیز کی کار تک پہنچے تو پارکنگ لاٹ میں لاتعداد کاریں دیکھ کر حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عزیز کی بڑی کار دیکھ کر میں بہت خوش ہوا جو کہ نیلے اور سفید رنگ کی تھی۔ اُس کی کار پر میں نے ایک عجیب سے نام کی تختی بھی دیکھی جس پر لکھا تھا: ”شلم برگز“۔ میں نے پوچھا:

”بھائی اس کا کیا مطلب ہے؟“

وہ اُس کمپنی کا نام تھا جہاں عزیز کام کرتا تھا۔ وہ ایک انجینئر تھا اور اُن زمینوں پر کام کرتا تھا جہاں سے تیل نکلتا تھا اور وہ خوب اچھے پیسے بنا رہا تھا۔

کچھ دیر ڈرائیو کرنے کے بعد ہم اُسکے گھر پہنچے جو ایڈمنٹن کے جنوب میں واقع تھا۔ وہ ایک پُرانا مکان تھا جو کہ اُس نے ایک معمر عورت سے کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو ساری گلیاں اور سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور یہ نظارہ میرے اپنے قصبہ سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے آخری بار مری کے پہاڑی علاقہ میں برف دیکھی تھی جو کہ پاکستان میں اسلام آباد کے قریب واقع ہے۔ لیکن ایڈمنٹن کی زمین پر پڑی ہوئی کئی انچ برف کے مقابلہ پر وہ بالکل ہلکی پھلکی سی برف کے چھینٹے تھے۔ دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو چار سو کینیڈا کی دھوپ تھی جو کہ کہر آلود اور تخیل بستہ تھی۔ میں نے اپنی خواب گاہ کی کھڑکی کے منجمد شیشے پر اپنا ہاتھ رکھا تو ہڈیاں تک سُن ہو گئیں۔ میرے لئے یہ ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔

میں نے اپنے بھائی کا مکان دیکھنا شروع کیا تو اُس کا باورچی خانہ دیکھ کر حیران رہ گیا جو کہ بالکل اُسی طرز کا تھا جو کہ مغربی فلموں میں دکھایا جاتا تھا۔ پاکستان میں تو ہماری والدہ جہاں کھانا پکایا کرتی تھیں ہم سب وہیں نیچے بیٹھ جاتے۔ ہم سب باورچی خانہ میں جمع ہو جاتے اور فرش پر جہاں چولہا جل رہا ہوتا اس کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ لیکن کینیڈا میں بے شمار نئے طور طریقے تھے جو کہ میرے لیے شروع شروع میں

حیران گُن تھے۔

بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کھانا پسند کرونگا۔ میں نے مذاقاً جواب دیا کہ آئس کریم۔ ہم کونے کی دکان تک پیدل چل کر گئے جو کہ ایک محرم ایشائی میاں بیوی کی تھی۔ اُس کو دیکھ کر مجھے پاکستان کی دکانیں یاد آ گئیں۔ عزیز نے وینلا آئس کریم کے ایک گیلن کا ڈبہ خرید کر مجھے دیا اور میں ایک گیلن ڈبے کو دیکھ کر حیران رہ گیا! پیچھے اپنے ملک میں تو میں صرف ایک چھوٹے سے کپ میں یا ڈنڈی سے لگی کُلفی کھایا کرتا تھا۔ اُس ایک گیلن آئس کریم کی قسمت میں لمبا عرصہ کی بقانہ تھی اور تھوڑی ہی دیر میں میں نے اُسے ختم کر ڈالا۔ جب تک میری رہائش اپنے بھائی کے گھر میں رہی میں اکثر اوقات اُس کونے والی دکان پر چلا جایا کرتا تھا جو کہ نزدیک ہی تھی اور دکان کے مالکان میاں بیوی سے دوستی بنالی۔

کینیڈا پہنچنے کے چند دنوں کے بعد عزیز نے مجھے کوئی کام ڈھونڈنے کی ترغیب دینا شروع کر دی اور میری بھی یہی خواہش تھی کہ کوئی کام ملے اور میری آمدن شروع ہو جائے۔ عزیز مجھے یاد دلاتا کہ:

”پاکستان میں تم نے بڑے مزے کی زندگی گزاری ہے۔ مگر اب تم کینیڈا میں ہو اور اگر یہاں کام نہیں کرو گے تو خالی جیب رہو گے۔ تمہیں یہاں پہنچنے کا جو موقع ملا ہے تو تمہارا نصب العین کامیابی و کامرانی ہونا چاہیے۔ اس کیلئے لازمی ہے کہ کوئی کام کاج تلاش کیا جائے۔“

میرے تین بھائی بہن ہیں۔ عزیز، عیشہ اور سیمہ اور تینوں ہی آجکل امریکہ میں آباد ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ اُن کے بچے ہیں اور بچوں کے آگے بچے۔ ہم سب بہن بھائیوں میں عزیز عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے۔ جیسے کہ میں پہلے ذکر کر آیا ہوں وہ ہمارے والدین کا دُلا راتھا۔ عزیز میری والدہ کا تو رگ جان، چہیتا اور محبوب تھا۔ میری والدہ کی نظر میں وہ کبھی بھی کوئی غلطی نہ کرتا تھا اور اُس کی موجودگی میں ہم تینوں کی کچھ بھی نہ چلتی تھی، بس عزیز ہی عزیزان کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ اگرچہ سیمہ ہماری والدہ کے بہت قریب تھی اور اس کا بہت خیال رکھتی تھی، مگر عزیز کی موجودگی میں سیمہ اور میں، ہم دونوں نہ ہونے کے برابر ہو جاتے!

عزیز کو چھوٹی عمر ہی سے ہمارے والد نے بہترین بورڈنگ اسکول میں داخلہ دلوایا تھا اور 15 سال کی عمر میں اُس نے پاکستان میں گلائڈر اڑانا شروع کر دیا تھا کیونکہ اُس کی خواہش پاکستان ائرفورس میں پائیلٹ بننے کی تھی۔ مگر اس میں اُسے کامیابی نصیب نہ ہوئی اور اُس نے انجینئر بننے کا فیصلہ کر لیا اور 1967ء میں کینیڈا کی البرٹا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

اُس کے بالمقابل میرے والد نے مجھے اُن اسکولوں میں داخلہ دلوایا جو کہ عمومی سطح سے نچلے درجہ کے تھے اور اس طرح میری تعلیمی بنیادیں کافی کمزور رہیں اور میں اسکول کی کلاسوں میں ایک کمزور طالب علم رہا۔ پھر بھی میں نے دلجمعی سے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور آخر پنجاب یونیورسٹی سے معاشیات کے مضمون میں ڈگری حاصل کر لی۔

ایڈمنٹن میں میری پہلی نوکری ملنے کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو میں ڈھیروں ڈھیروں پیسے کمانا شروع کر دوں اور آناً فاناً میرے کیرئیر بن جاؤں۔ میں اپنی خوابوں میں بسا رہا لیکن ذہن میں کوئی باقاعدہ واضح منصوبہ نہ تھا۔ میں جو بھی کماتا تو ہر ایک ڈالر کی قیمت کے برابر پاکستانی روپے سے ضرب دیکر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ اُس وقت کینیڈین ڈالر کی قیمت ساٹھ، ستر پاکستانی روپے کے برابر تھی اور اتنی بڑی رقم میرے دماغ میں نہ سما سکتی تھی اور میں عیش عیش کر اُٹھتا۔ میری انگریزی بھی کافی کمزور تھی اور کسی کام میں کوئی خاص مہارت بھی نہ تھی اور نہ ہی کوئی تجربہ جو کہ کسی اچھی آمدن والی نوکری کی درخواست پر میں لکھ سکتا۔ بہر حال میرے سہانے خوابوں میں کمی نہ ہوئی اور میرے اندر کامیابی حاصل کرنے کی آگ لگی ہوئی تھی۔ میں اکثر اوقات اپنے والدین کی نصیحت یاد کرتا:

”یونس! ایک اچھا انسان بننا، ہر ایک سے اچھا سلوک رکھنا اور ہمیشہ

خدا سے مانگنا۔“

اُن کے ہاتھوں میں نے کافی سختیاں اُٹھائی تھیں مگر مجھے معلوم تھا کہ اُنکی مجھ سے اچھی اُمیدیں وابستہ ہیں اور ایک دن میں کچھ نہ کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ پہلی نوکری کی تلاش میں عزیز نے میری مدد کی۔

ہم دونوں ایک آرمی اور نیوی ڈیپارٹمنٹل سٹور گئے جہاں اشیاء کم قیمت پر بکتی تھیں۔ وہاں سے کینیڈا کی سردی برداشت کرنے کے لئے گرم کپڑے خریدے کیونکہ

پاکستانی سردی کے کوٹ یہاں البرٹا میں بالکل بیکار تھے۔ اُس سٹور میں میری ملاقات زندگی میں پہلی بار ایک ہندوستانی نوجوان سے ہوئی جو وہاں ملازم تھا۔

اُن دنوں پاکستان اور ہندوستان کے مابین جارحانہ تعلقات تھے لیکن ہم دونوں کینیڈا میں تھے اور یہاں ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ رویہ رکھنا بے فائدہ توضیح اوقات تھا۔ اس سٹور میں ہر ایک چیز سستے داموں میں تھی۔ عزیز نے میرے لئے ایک بڑا بھاری گرم کوٹ، برف پر چلنے کے جوتے، جینز، ایک بڑی آرام دہ روئیں کی ٹوپی اور گرم دستاں خریدے۔ گرم کوٹ کو دیکھ کر میں نے مذاقاً کہا:

”یہ کوٹ تو اتنا بھاری ہے کہ اس میں تو میں پسینہ پسینہ ہو جاؤں گا۔“

وہ مجھے باہر لے گیا اور دکھایا کس قدر شدید سردی تھی اور مجھے احساس ہوا کہ وہ تمام چیزیں کتنی ضروری ہیں۔ اُس نے بُشری کو بھی گرم کپڑے خرید کر دیئے۔

میں نے دن رات کام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ عزیز نے مجھے بتایا کہ ایک مقامی اخبار ”ایڈمنٹن جرنل“ میں نوکری کے اشتہار پڑھا کروں اور اشتہار دینے والوں سے بذریعہ ٹیلیفون رابطہ قائم کروں۔ لیکن میری انگریزی کا لہجہ قدرے سخت تھا اور مقامی لوگوں کے لئے میری بات سمجھنا محال تھی اس لئے نوکری ڈھونڈنے کا یہ طریقہ میرے کسی کام نہ آیا۔

جب بھی میرا بھائی اپنے کام کے اوقات سے فارغ ہوتا اور چھٹی کے ایام میں وہ مجھے اپنی کار میں بیٹھا کر شہر کے مختلف علاقوں میں لے جاتا اور ہم اُن جگہوں کے متلاشی

رہتے کہ جہاں ”مدد درکار ہے“ کا سائن بورڈ لگا ہوتا۔ کام کی تلاش میں اس طرح گھومتے پھرتے ایک دن ہمیں ویلڈنگ کے ایک کارخانہ کا پتہ چلا جہاں ملازموں کی ضرورت تھی۔ مجھے ویلڈنگ کا کچھ بھی تجربہ نہ تھا مگر پھر بھی ہمت کر کے میں اندر چلا گیا اور ملازمت حاصل کرنے کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے مجھے فوراً ایک دوسرے ادارے کی طرف بھیج دیا جو ملازمت دلواتا تھا۔ وہاں میری گفت و شنید ایک بھاری بھر کم درمیانی عمر کے آدمی سے ہوئی جس نے نیلے رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کا رویہ کافی دوستانہ تھا اور اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کارخانے کا فورمین ہے اور اُس نے مجھ سے چند سوالات پوچھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کیا میں کام کے دوران جسمانی طور پر کارخانے کی بھاری مشینوں کو سنبھال سکوں گا یا نہیں۔ اُس کارخانے میں کام کرنے والوں کی اشد ضرورت تھی اور خوش قسمتی سے میں بالکل ٹھیک وقت پر ٹھیک جگہ آپہنچا تھا۔

فوراً ہی میں نے کاغذات پر دستخط کئے اور مجھے مطلع کیا گیا کہ میری تنخواہ تین ڈالرز اور 31 سینٹ فی گھنٹہ ہوگی۔ مجھے معلوم تھا کہ اُن دنوں کم سے کم تنخواہ صرف تین ڈالرز فی گھنٹہ تھی، اس لئے میں بے حد خوش تھا کہ مجھے پہلی ملازمت مل گئی ہے۔ میں خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے بھائی کے پاس آیا جو کہ کار میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ہجانی کیفیت میں اُسے خوشخبری سنائی:

”بھائی، مجھے کام مل گیا! اور وہ مجھے تین ڈالرز اور 31 سینٹ فی گھنٹہ تنخواہ

دیں گے!“

یہ سن کر اُس کے چہرے پر خنکی کے آثار آ گئے۔ اُس نے مجھے کہا کہ مجھے اُس سے زیادہ کی تنخواہ کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔

”تمہیں چاہیے تھا کہ تم کہتے کہ تمہیں پاکستان میں ویلڈنگ کا تجربہ ہے۔“

میں بالکل نیا تھا اور کام ڈھونڈنے کی خاطر میں پسند نہیں کرتا تھا کہ سفید جھوٹ بولوں۔ اُس نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سمجھایا کہ آئندہ کام کے انٹرویو کے دوران میں زیادہ تنخواہ مانگا کروں۔ بہر حال، اُس کے خشک رویے کے باوجود میری خوشی کے جذبات میں کوئی کمی نہ آئی۔

اگلے روز میں اپنے گرم گرم بستر سے سرکتا ہوا باہر نکلا اور گھڑی پر وقت دیکھا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ یعنی کینیڈا میں اپنے پہلے کام پر جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اور میرا پہلا کام میٹل فیبریکس کمپنی میں ویلڈر کے ایک ماتحت کا تھا۔

میں نے اٹھ کر اپنے دانت صاف کیے، غسل کیا اور قبلہ رخ اپنا جائے نماز بچھا کر نماز ادا کرنے کھڑا ہو گیا۔ قیام کے بعد رکوع اور پھر سجدہ میں چلا گیا اور دعا کرتا رہا:

”اے رب العالمین، ہم جاگے ہیں اور تیری خاطر تمام جہان جاگ چکا ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے اپنی زندگی کا بہترین دن طلب کرتا ہوں اور تیری درگاہ سے فتح و ظفر، نور و برکات اور رہنمائی کا طلبگار ہوں۔ میں

آج کے دن کی اور آنے والے تمام دنوں کی بدیوں سے تجھ میں پناہ مانگتا ہوں!“

میں ہمیشہ صبح سویرے اٹھنے کا عادی رہا ہوں جس کے لئے اللہ تعالیٰ کا مشکور ہوں۔ ناشتہ کرنے کے بعد تقریباً صبح چھ بجے میں کام کرنے گھر سے نکل گیا۔

اکثر اوقات میں دودھ اور دلیہ کے ساتھ ناشتہ کیا کرتا اور جس دن کوئی رات کی بچی ہوئی روٹی مل جاتی تو میری خوشی دو بالا ہو جاتی۔ کبھی کبھی ناشتے کے لئے میں مرچ مصالحہ اور پودینہ ڈال کر انڈوں اور سبزی کا آلیٹ بھی بنا لیا کرتا تھا۔ پہلے دن کام پر پہنچ کر میں اپنے فورمین، جس کا نام ڈیرل تھا، سے ملا۔ اُس نے مجھے کام پر پہننے کے دستانے، پلاسٹک کی بنی ہوئی بڑی کالی عینک اور ایک لمبا کوٹ دیا اور میرا تعارف ایک دوسرے ویلڈر سے کروایا جس کے ماتحت مجھے کام کرنا تھا۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ لوہے کو تپا کر جوڑنے کے لئے کیسے پیسا اور چھانا جاتا اور کس طرح ملائم کیا جاتا ہے۔ میں نے بھی بھرپور محنت سے کام کرنا شروع کیا اور وہ میرے کام سے خوش تھا۔ اور اُس نے میرا اعتماد بڑھانے کے لئے کافی حوصلہ افزائی کی اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں یہ کام کر سکوں گا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے وہاں گھڑی سے منسلک ایک مشین میں چار بار ایک کارڈ ڈال کر نکالنا پڑتا تھا۔ میرے خیال میں ایسا کرنا وقت کا اندازہ لگانے کے لئے تھا۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس طریق سے ہمارے کام کرنے کے اوقات گنے جاتے ہیں کہ کتنے گھنٹے کام کیا اور اُن گھنٹوں کی مناسبت سے ہمیں ہر دو ہفتوں کے بعد تنخواہ ملا کرتی

تھی۔

کینیڈا میں میری طرح دوسرے ممالک سے آئے ہوئے جو مہاجر بستے تھے اُن کو کمائی کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ میری بھی پوری کوشش تھی کہ محنت کی کمائی سے رقم جمع کروں۔ اُس وقت وہاں کا سیاسی ماحول بھی مہاجرین کے حق میں تھا۔ 1971ء میں وہاں کے وزیراعظم پیری ٹرڈیو نے اعلان کیا کہ کینیڈا ایسی راہ عمل اپنائے گا جو کہ متفرق سماجوں کے باہمی اتحاد سے رہنے کے لئے مدد ثابت ہوگا اور دنیا میں اپنی مثال آپ ہو گا۔ اُس کے اس اعلان کی کوئی مخالفت بھی نہ ہوئی۔ یعنی اُن ایام میں کینیڈا مجھ جیسے نو آور دلوگوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

ایک مہاجر ہونے کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ میرا سب سے بڑا اثاثہ قوتِ ارادی اور محنتِ شاقہ ہے۔ اس لئے میں نے اپنا فخر یہ لبادہ اتار پھینکا اور پاکستان کے ایک گاؤں کے لمبردار کا بیٹا ہونے کے احساس کو ذہن سے نکال دیا اور کوئی کام بھی جس سے میں قانونی طور پر پیسے بنا سکتا تھا اپنے لئے ہیج نہ سمجھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں رقم بنانا کوئی آسان کام نہیں اور نہ ہی کوئی مختصر راہ اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس لئے میں انتہائی محنت سے کام کرتا رہا۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ مجھے مقامی کینیڈین لوگوں کی نسبت زیادہ محنت سے کام کرنا پڑے گا، کیونکہ انگریزی زبان میں گفتگو کرنے کی اہلیت کمزور تھی اور یہاں کینیڈا میں کسی دوسرے ملک سے حاصل کردہ کالج کی سند بھی بیکار تھی۔ اسلئے میرا منترہ بن گیا کہ:

”اس دنیا میں ہر چیز کا حصول ممکن ہے، مگر اُس کیلئے عملِ پیہم درکار ہے۔“

جب میں اس ملک میں آیا تو اُس وقت میری جیب میں صرف تیس ڈالرز تھے، لیکن ذہن میں ایک خواب تھا کہ ایک دن میں اس رقم کو ایک بڑی دولت میں بدل لوں گا۔ یہاں مجھے مالی نقصان کا کوئی خطرہ تو تھا نہیں، البتہ فائدہ ہی فائدہ اٹھانے کی اُمید تھی۔ اس لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرتے وقت میرا ذہن کامیابی کے حصول پر مرکوز رہا۔

شروع سالوں میں میرا خواب یہ تھا کہ ایک لاکھ ڈالرز جمع کر کے واپس پاکستان چلا جاؤں گا، وہاں جائیداد خرید کر کرایہ پر چڑھاؤں گا اور کرایے کی آمدن سے اپنی بقیہ تمام زندگی بغیر کوئی کام دھندہ کئے آرام سے گزاروں گا۔ یہ ایک نوجوان لڑکے کا سہانا خواب تھا اور اُس وقت میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس طرح اندھیرے میں میرا چھلانگ لگانا مجھے وہاں پہنچا دیگا کہ جہاں کہ میں آج کھڑا ہوں۔ یہ محض انعامِ خداوندی ہے۔

میٹل فیبریک کی کمپنی نے بہت سے نئے آنے والے مہاجرین رکھ لئے تھے اور میرے ساتھ کام کرنے والے لوگ تمام دنیا کے باشندے تھے۔ دوپہر کھانے کے وقفے کے دوران میں اُن کے طرح طرح کے کھانے دیکھ کر حیران ہوتا۔ کوئی پیزا لے آتا، کوئی قسمائسم کے پاستا لے آتا اور کوئی بھنا گوشت، مچھلی، سینڈوچ اور دیگر انواع کے کھانے لے آتا جن کی مجھے کچھ بھی پہچان نہ تھی۔ میں اپنا عام کھانا، یعنی روٹی اور شوربہ اپنے ساتھ لانا بالکل پسند نہ کرتا تھا۔ بُشری یا میں خود سلاد، پنیر، ٹرکی یا گائے کا بھنا

گوشت روٹی کے اندر رکھ کر ایک سینڈوچ بنالیا کرتے تھے تاکہ میں وہاں کے ماحول میں گھل مل جاؤں اور ایسا کرنا میرے لئے ترقی کے زینے پر چڑھنے کے لئے ضروری تھا۔

دو ہفتوں کے بعد جب مجھے تنخواہ کا پہلا چیک ملا تو وہ تقریباً 265 ڈالر کا تھا جو کہ میرے لئے ایک بہت ہی بڑی رقم تھی۔ جب میں نے وہ چیک کیش کروایا تو اتنی زیادہ رقم زندگی میں اس سے پہلے کبھی بھی میرے ہاتھوں میں نہ آئی تھی۔

میں نے اُس میں سے آدھی رقم تو اپنے والدین کو بھجوا دی اور کچھ صدقہ خیرات میں دے دی۔ پاکستان میں بچپن ہی سے مجھے سکھایا گیا تھا کہ گھر والوں کا خیال رکھنا چاہیے اور غریبوں کی مدد کرنی چاہیے۔ اس لئے مستحق لوگوں کی مالی مدد کرنے کی نیکی کا مجھے ہمیشہ احساس رہا ہے اور زندگی بھر اپنی آمدن سے دوسروں پر خرچ کرنا میری عادت بن چکی ہے۔

پیسے بنانے کی مجھے ضرورت بھی تھی اور شوق بھی تھا، لیکن میٹل فیبریکس کمپنی میں ایک ماتحت ویلڈر کے طور پر کام کرنا میرے لئے جسمانی اور جذباتی تکلیف کا باعث بنا شروع ہو گیا۔ ہر روز کام کرتے وقت ویلڈنگ مشین سے آگ کے شرارے اُڑتے اور اکثر اوقات تیز تیروں کی طرح مجھے آ لگتے۔ اسی طرح ہر روز آٹھ گھنٹوں تک لوہا پیسنے کی خرخر کی متواتر آواز سے میرے کان دُکھنے لگتے۔

میرے حوالے کام بھی سخت تھا اور دن بدن کام کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا

رہا تھا۔ مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرنے کی اضافی اجرت بھی نہیں ملتی تھی۔ 3.31 ڈالر فی گھنٹہ کی کمائی سے مجھے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں پہنچ رہا تھا۔ آخر تک آکر میں نے فیصلہ کیا کہ اس کام کو چھوڑ کر کوئی نیا کام تلاش کروں

مجھے گھر سے کام تک آنے کیلئے بس لینی پڑتی تھی۔ انہی دنوں ایڈمنٹن کے بسوں کے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔ اُن کی اکثریت تنخواہوں میں 37 فیصد کے اضافے کا مطالبہ کر رہی تھی مگر شہر کی انتظامیہ کو اُن کا مطالبہ منظور کرنے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نتیجہً 70 ہزار لوگ جو کہ روزانہ بسوں میں سفر کرتے، انہوں نے یا تو کاروں میں آنا جانا شروع کر دیا یا بائیسیکل استعمال کرنے لگے۔

میرے گھر سے کام تک پہنچنے کا راستہ بذریعہ کار آدھے گھنٹے کا تھا اور بس کے ذریعہ ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا اور اگر میں ہیج ہائیک کرتا، یعنی بیگانے لوگوں کی منت کر کے اُن کی کاروں میں سفر کرتا تو تقریباً دو گھنٹے لگ جاتے۔ میری اپنی پسند کے ذرائع آمد و رفت بالکل محدود تھے اس لئے میں ہیج ہائیک کرتا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اُن کی کاروں میں بیٹھ کر کام پر آتا جاتا۔

وہ دن ایڈمنٹن میں سخت سردی کے دن تھے اور موسم سرما کی انتہائی تکلیف دہ ہوائیں چلتی تھیں اور اس حال میں میں سڑک کنارے کھڑے ہو کر آنے جانے والی کاروں کو اشارہ کرتا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر لے جائیں۔ میں سڑک پر چلتا رہتا اور اپنے گھر کی جانب جانے والی کسی کار کا انتظار کرتا۔ بعض اوقات سردی کے باعث

میرے ہاتھ پاؤں بے حس ہونا شروع ہو جاتے اور کچھ دُور چلنے کے بعد میں کسی دُکان کے اندر چلا جاتا تا کہ گرم ہو جاؤں اور سردی سے منجمد ہو کر مرنے جاؤں۔ میں ہر روز انتہائی شدید سردی میں باہر کھڑے ہو کر انجان لوگوں کی منت کرتا کہ وہ مجھے گھر سے کام تک اور کام سے گھر تک سواری دے دیں اور ایسا کرنا خطرہ مول لینے سے خالی نہ تھا۔ مگر اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا چارہ بھی نہ تھا کہ میں اپنا روزگار جاری رکھ سکوں۔ اس تمام عرصہ میں دوسروں کی ہمدردی اور کشادہ دلی کا ممنون احسان رہا ہوں۔

بعض اوقات میرے ذہن میں مختلف سوالات اُٹھنے لگتے:

”میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ یہاں تو میں سردی میں مر جاؤں گا۔ کتنا

بُرِ حال ہے۔ میرا یہاں! دل ٹوٹا جا رہا ہے۔“

لیکن کینیڈا کے لوگ بہت اچھے اور ہمدرد تھے۔ اکثر وہ اپنی کاریں روک کر دوسروں کو سواری دیتے اور اُن کو اُن کی منزل تک پہنچا دیتے۔ میں جب کسی کی کار میں سوار ہوتا تو بعض اپنی کار کے اندر کا درجہ حرارت بڑھا دیتے تا کہ مجھ سردی کے مارے کو کچھ آرام مل جائے۔ بعض مجھ سے مختلف سوالات پوچھنے لگتے میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں؟ اکثر وہ میرے متعلق متحسّس رہتے۔

اس طرح بسوں کی ہڑتال کے دنوں میں میری ملاقات بہت سے دلچسپ لوگوں سے ہوتی رہتی۔ میں نے دیکھا کہ اُن میں سے اکثر میرے ہم عمر نو جوان ہی ہوا کرتے تھے جو مجھے اپنی کار میں بٹھا لیتے اور اُن میں سے کوئی بھی مجھ سے خوفزدہ نہ ہوتا اور مجھے

بھی اُس دوران کوئی خطرناک واقعہ پیش نہ آیا۔ ایک دفعہ تو ایک نوجوان نے بہت اصرار کرنا شروع کیا کہ میں اُس کے ساتھ اُس کے اپارٹمنٹ بھی جاؤں۔ لیکن میرے انکار کرنے پر اُس نے بُرا منائے بغیر مجھے میری منزل پر لیجا کر اُتار دیا۔ اس طرح اکثر اوقات میرا تجربہ بہت مثبت رہا اور مجھے مقامی لوگوں سے گفتگو کرنے اور اُن کے طرزِ زندگی سے مانوس ہونے کا موقع ملتا رہا۔

بسوں کی ہڑتال لوگوں کے لئے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ کئی لوگوں کی نوکریاں چلی گئیں، کاروبار آہستہ آہستہ کمزور ہونا شروع ہو گئے اور خصوصاً کرسمس کے دنوں میں خرید و فروخت کافی ٹھنڈی پڑ گئی۔ وہ ہڑتال 50 دنوں کے بعد ختم ہوئی اور یونین کے ساتھ ایک نیا معاہدہ ہو گیا جس میں ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ شامل تھا۔ مجھے ہڑتال کے ختم ہونے پر بڑی خوشی ہوئی۔

اُنہی دنوں میرا بھائی اور بھابی اپنے پہلے بچے کی متوقع ولادت پر اُسے خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہے تھے جس نے جنوری 1980ء میں پیدا ہونا تھا۔ اُس کی خاطر وہ پہلے مکان کو چھوڑ کر کسی بڑے مکان میں منتقل ہونے کا سوچ رہے تھے جو کہ افرادِ خانہ میں اضافہ ہونے کے مناسب حال ہو۔ انہوں نے ایک نئی آبادی مل وُڈ میں ایک ٹاؤن ہاؤس کرائے پر لینے کی تلاش شروع کر دی۔ اسی صورتِ حال میں دیوار پر لکھا ہوا مجھے صاف نظر آ رہا تھا:

”اب تم رہائش کے لئے اپنی الگ جگہ ڈھونڈو!“

انہوں نے بڑی نرمی سے مجھے سمجھایا کہ وقت آگیا تھا کہ میں اپنی علیحدہ جائے رہائش تلاش کروں۔ میرے بھائی نے اپنے مکان کا تہ خانہ ایک پاکستانی طالب علم بنام ماہنی کو کرایہ پر دیا ہوا تھا جو کہ وہاں اپنی ایک دوست لڑکی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اُن کو بھی اپنے لئے نئی جگہ تلاش کرنے کو کہا گیا۔

بدلتے ہوئے حالات میں میں نے فوراً کفیں چڑھا کر اپنے رہنے کے لئے نئی جگہ تلاش کرنا شروع کر دی اور جلدی مجھے کرایے پر ایک اپارٹمنٹ مل گیا جو بُشری کے کام کی جگہ سے بھی قریب تھا۔ 1980ء کے شروع ہی میں ہم دونوں وہاں منتقل ہو گئے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں، زندگی کے شروع سالوں میں عزیز اور میرے درمیان کچے پکے سے باہمی تعلقات تھے۔ مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا باہمی لگاؤ پھیلتا پھولتا رہا۔ میرا بھائی ایک زیرک تاجر اور بہت اچھا بھائی ہے۔ اُس نے خاندان والوں کی بھی بہت خدمت کی ہے اور ایک عقلمند انسان ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور زود فہم ہے اور میں اس نعمت پر خداوند تعالیٰ کا بے حد مشکور ہوں کہ تمام بھائی بہنوں سے میرے تعلقات آج تک اچھے رہے ہیں۔

اُن ہی دنوں بُشری نے ایک شادی شدہ جوڑے سے دوستی بنالی جن کا نام رمیش اور تارا تھا اور وہ دونوں ہی ہندوستان سے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شروع میں میں اُن دونوں کو پسند نہ کرتا تھا کیونکہ ان کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ 1965ء اور 1971ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی جنگوں کی وجہ سے میرا ذہن ہندوستان

کے خلاف تھا۔ مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ بُرے اور ناقابلِ اعتبار لوگ ہیں۔ لیکن جب بھی بُشریٰ اور مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو ہمیشہ ہماری مدد کرتا اور آہستہ آہستہ ہم اچھے دوست بن گئے اور یہ دوستی پھر زندگی بھر قائم رہی۔

جب میں نے رہائش کے لئے اپارٹمنٹ کی تلاش شروع کی تو اپنی پسند کی جگہ ڈھونڈنے کے مواقع بہت محدود تھے کیونکہ میری آمدن کچھ زیادہ نہ تھی۔ میں تو کوئی عمدہ سا اپارٹمنٹ کرایہ پر لینا چاہتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ زیادہ مہنگا اپارٹمنٹ لینا میرے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے اپنے محدود بجٹ کے اندر رہتے ہوئے میں نے اچھی سے اچھی جگہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں مٹی اور کچھڑ سے پُر راستوں والے خستہ حال گاؤں میں رہنے کے بعد میرے لئے ہر دوسری جگہ اُس سے بہتر تھی۔ بعض اوقات میں جب کسی اچھی نوعیت کے اپارٹمنٹ کے متعلق دریافت کرتا تو اپارٹمنٹ کے مینیجر مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے کیونکہ انہیں صاف نظر آ رہا ہوتا تھا کہ میں اس ملک میں ایک نووارد ہوں۔ مجھے اُن کے ذہنوں میں سے گزرنے والا سوال سنائی دے رہا ہوتا:

”یہ پاکی ماڈرن آسائشوں سے پُر اپارٹمنٹ کے کرایہ کی استطاعت

کہاں رکھتا ہے؟“

1970 اور 1980 کے درمیانی عرصہ میں مقامی لوگ جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے

تمام لوگوں کے لئے ’پاکی‘ کا عیاں لفظ استعمال کرتے تھے۔

آخر کار میری تلاش ختم ہوئی اور میں نے ایک چھوٹا سا پارٹمنٹ کرایہ پر لے لیا کہ جس کی میں استطاعت رکھتا تھا۔ وہ ایک گنجان جگہ تھی اور قطار در قطار مختلف جسامتوں اور صورتوں کے لاکھ پارٹمنٹوں کی وہاں عمارات تھیں۔ قریب ہی ایک پارک بھی تھا جہاں بچے کھیلتے رہتے تھے۔ وہ جگہ ایڈمنٹن شہر سے صرف پانچ دس منٹ دور تھی۔ وہاں کی بڑی گلی سے CN ٹاور نظر آتا تھا جو کہ 1970ء کے سالوں میں سُرخ روشنی کا ایک منارہ تھا جس سے شہر میں گھومنے پھرنے میں سہولت رہتی تھی۔

بُشریٰ نے کپڑے تیار کرنے کی ایک فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا تھا جس کا نام گرین ویسٹرن گارمنٹ کمپنی تھا۔ اس کے کام سے ہمارا پارٹمنٹ قریب تھا اور ایک بس سٹاپ بھی چند منٹوں کے فاصلہ پر تھا۔

ہمارے پہلے پارٹمنٹ کی قسمت میں بھی ایک ڈرامے کا حصہ بننا لکھا تھا۔ وہاں ہماری رہائش کے چند دنوں کے بعد ہی ایک دن پولیس نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پولیس کو دیکھ کر ہمیں پریشانی ہوئی۔ پولیس آفیسر نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم نے تیسری منزل سے آنے والی کوئی آوازیں سنی تھیں؟ ہم نے نفی میں جواب دیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ تیسری منزل پر رہنے والے میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑا ہو گیا تھا اور پولیس کو اُن کی خانہ جنگی ختم کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔

یہ معلوم ہوتے ہی ہم دونوں پر خوف طاری ہو گیا۔ شراب کے نشے میں لڑائی جھگڑا شروع ہو جانا عام سی بات تھی۔ اس لئے ہم نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ وہاں سے نکل کر

نزدیک کسی دوسری جگہ ایک بیڈروم والے اپارٹمنٹ میں چلے جائیں۔ ہمیں ہمارے نئے اپارٹمنٹ میں پہنچانے کے لئے ریٹش اپنی پرانی کار لے کر آ گیا۔ ہم نے اپنا صوفہ سیٹ اُس کار کی چھت کے اوپر باندھا اور گھر کے باقی سارے سامان سے اُسکی کار بھر دی۔

میرے دن کا زیادہ تر وقت کسی نئے کام کی تلاش میں صرف ہو جاتا تھا اور شام کو میں ٹیلی ویژن پر برف کے اوپر کھیلی جانے والی ہاکی دیکھا کرتا۔ اور اپنی مقامی ہاکی ٹیم ’ایڈمنٹن آئلز‘ کا شیدائی بن گیا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ مجھ سے ہاکی کا کوئی میچ دیکھنے سے رہ گیا ہو۔ آئلز اور مانٹریال کینیڈیز میری پسندیدہ ٹیمیں تھیں اور اگر اُن میں سے کوئی ٹیم ہار جاتی تو مجھے سخت صدمہ پہنچتا۔ ان ٹیموں کے بعض کھلاڑی میرے ہیرو بن گئے تھے جیسے آئلز کا وین گرٹ ذکی، اور مانٹریال کینیڈیز کے گائیلاف لیو اور کین ڈرائیڈن اور جلد ہی فٹبال اور کرکٹ کی محبت کا آخری جامہ میرے دل سے اُتر گیا۔

میں بڑی تیزی کے ساتھ مغربی رنگ میں رنگین ہوتا جا رہا تھا۔ میں باقاعدگی کے ساتھ عوامی پسندیدہ پروگرام ہوگنز ہیرو سز (Hogans Heroes) اور دی سنی اینڈ شرشو (The Sonny and Sher Show) دیکھا کرتا تھا۔ بہت لمبے عرصہ تک ’ہوگنز ہیروز‘ میرا پسندیدہ شورہا کیونکہ کچھ دیر کے لئے مجھے پاکستانی فوج سے وابستگی کا تجربہ ہوا تھا۔ خصوصاً کرنل کلنٹ بہت پسندیدہ تھا جو کہ ایک مزاحیہ اور بھونڈا فوجی افسر تھا اور امریکی فوجی اُس کا خوب مذاق بناتے تھے۔ پُر تھ کاوٹ لمبے دن کے بعد

سارجنٹ ٹمپلس کی مضحکہ خیز حرکات مجھے خوش کر دیا کرتی تھیں۔ ایسے کھیل تماشے دیکھنا نہ صرف میرے لئے مستور گُن تھے بلکہ اُن کو دیکھنے سے میری انگریزی بول چال بھی بہتر ہونا شروع ہو گئی۔

مجھے میرے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ میں ٹیکسی چلانا شروع کر دوں اور اس طرح نہ صرف میری آمدن میں جلد اضافہ ہوگا بلکہ فارغ اوقات میں کوئی دوسرا کام بھی کر سکوں گا۔ میں نے ٹیکسی چلانے کا امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ اور ٹیکسی ڈرائیونگ کا لائسنس حاصل کر لیا۔ اس لائسنس کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ میں ثابت کرتا کہ مجھے ایڈمنٹن کے گلی کوچوں اور مقامی نقشوں سے واقفیت ہے۔ اس کیلئے میں نے شہر کے مختلف علاقوں کی سیاحت شروع کر دی اور بعض دن میں ارادۂ شہر کے مغربی علاقے کی طرف نکل جاتا جہاں اکثریت امیر لوگوں کی رہائش پزیر تھی۔ میں وہاں بڑے بڑے مکان دیکھ کر اُنکی تعریف کرتا اور تصور کرتا کہ ایک دن میرا بھی ایسا ہی شاندار مکان ہوگا۔ میرے لئے ٹیکسی چلانا غیر متوقع طور پر منافع بخش اور خوش گُن ثابت ہوا۔ روزانہ مجھے کافی ساری نقد رقم مل جاتی اور اکثر اوقات میں ایک دن میں 75 ڈالرز یا اس سے زیادہ منافع کما لیتا۔ لیکن اس کے لئے مجھے کافی محنت کے ساتھ ٹیکسی ادھر ادھر دوڑانی پڑتی۔ البتہ ہفتہ اتوار کے دنوں میں ایک شفٹ میں 100 ڈالرز تک منافع ہو جاتا اور یہ رقم ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد کی ہوتی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے میں نے اپنے وقت کی قدر کرنا بھی سیکھا اور آج تک اُن لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جن کا یہ

پیشہ ہے۔

اس کام میں مجھے طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا۔ کئی سواریاں تو نشہ میں دھت ہوتیں لیکن زیادہ تر وہ فراغ دل لوگ ہوتے۔ ایک دن مجھے بہت ساری رقم بخشیش کے طور پر دیتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ وہ بہت امیر آدمی ہے:

”جی جناب! آپ واقعی ہی بہت امیر آدمی ہیں۔“

میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے مثبت میں سر ہلا کر جواب دیا۔

شراب کے نشہ میں مخمور مسافروں سے میں بہت ملائمت سے بات کرتا، اپنی غربت کی کہانی سناتا اور اُن کو کہتا کہ میں کینیڈا میں بس تھوڑی مدت کے لئے ہی ہوں۔ جلدی واپس اپنے وطن لوٹ جاؤں گا۔ بعض دفعہ یہ حربہ کام آجاتا اور ایک غریب ملک سے آنے کی درد بھری داستان سُن کر وہ مجھے بڑی سی رقم بطور بخشیش دے دیتے۔

میری جو سواریاں نشہ کی حالت میں ہوتیں میں ضروری سمجھتا تھا کہ اُن کو اُنکے گھر کے دروازے تک لیجا کر چھوڑ آؤں۔ خصوصاً وہ مسافر کہ جن کا رویہ سواری کے دوران میرے ساتھ اچھا ہوتا۔ کبھی کبھار بعض شرابی مسافر غصیلے اور لڑنے جھگڑنے والے بھی مل جاتے۔ میں اُن سے رقم لیکر اُن کے گھروں کے سامنے اتار دیا کرتا۔ ایک دفعہ دو مقامی کینیڈین میری کار میں سوار ہوئے اور دونوں غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک نے مجھے ڈانٹتے ہوئے چلا کر کہا:

”اے پاکی! تو نے میری ملازمت چھین لی ہے!“

اور واقعی یہ بات مجھے کئی بار سننا پڑی۔

”جاؤ..! واپس اپنے گھر جاؤ، اپنے پاک و وطن لوٹ جاؤ۔“

اسکے علاوہ، بعض دفعہ یوں بھی ہوتا کہ لوگ کار سے اتر کر کرایہ دیئے بغیر ہی بھاگ جاتے۔ میں نے ایسے لوگوں کا کبھی پیچھا نہیں کیا اور انکو جانے دیا۔

کینیڈا کی سخت سردی کے موسم میں ٹیکسیوں کو سردی میں محفوظ طور پر چلانے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ ایڈمنٹن کی موڑدار بریلی سڑکوں پر کار کے پھسل جانے کا کافی امکان تھا۔ اس لئے ایسے موسم میں اُسے چلانے کے لئے کافی احتیاط اور مہارت درکار تھی۔ جب برف باری شروع ہوتی تو سڑکیں صاف کرنے والے بڑی بڑی سڑکوں سے تو برف صاف کر دیا کرتے تھے، مگر چھوٹی سڑکیں خاصی بریلی اور پھسلنی ہوتیں اور اُن پر ٹیکسی چلانا کافی مشکل ہو جاتا۔

لیکن موسم سرما کے بعض فائدے بھی تھے۔ جب لوگوں کی جان جوکھوں میں ہوتی تو وہ مجھے فون کر کے بلاتے کہ اُن کو روٹی، دودھ اور دیگر ضروری اشیاء خرید کر لادوں۔ وہ میرے کام سے بہت خوش ہوتے کہ اتنے خراب موسم میں میں نے انکا کام آسان کر دیا اور مجھے اچھی خاصی بخشیش دے دیتے۔

میری زندگی گل وقتی اور جُز وقتی کاموں کے گرد گھوم رہی تھی۔ میرا یہی ارادہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ پیسے بناؤں۔ اس لئے میں نے ایک جُز وقتی کام بھی شروع کر دیا۔ وہ بونی ول نامی ایک شاپنگ سینٹر میں پہرہ داری کا کام تھا۔ وہاں مجھے پہرہ دار کی وردی

پہن کر ادھر ادھر چہل قدمی کرنا اور لوگوں کو خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں ارادۂ مقامی کینیڈین لوگوں سے گفتگو کرتا تا کہ مجھے انگریزی بول چال میں مہارت حاصل ہو جائے۔ مجھے لوگوں سے گفتگو کرنے اور اپنا تعارف کروانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی اور انگریزی میں بات کرتے وقت غلطیاں کرنے کی بھی پرواہ نہ تھی۔ ہاں البتہ جب مجھے کوئی اپنا ہم رنگ سانولا چہرہ نظر آتا تو میں ایک طرف کھسک جاتا تا کہ وہ مجھے انگریزی بولتا ہوا نہ سُن لیں۔ مجھے سانولے رنگ کے لوگوں کے سامنے انگریزی بولنے میں کافی گھبراہٹ ہوتی تھی کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ نکتہ چینیاں کریں گے اور میرا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن مقامی کینیڈین لوگ میری زبان کی غلطیوں کی کوئی پرواہ نہ کرتے اور بات چیت کے بعد آگے نکل جاتے۔

پہراہ داری کے کام میں مجھے کچھ اور فائدے بھی حاصل ہو گئے۔ یعنی مجھے وہاں کی دکانوں سے چیزیں خریدتے وقت کم قیمت ادا کرنی پڑتی اور مجھے معلوم تھا کہ کم قیمت کا مجھے کہاں فائدہ اٹھانا ہے، یعنی آئس کریم کی دکان پر۔ میں آئس کریم کی دکان پر جا کر وہاں کام کرنے والوں کے ساتھ گپ شب لگاتا اور وہ آئس کریم تیار کر کے اکثر مجھے مفت ہی دے دیا کرتے تھے۔

میٹل فیبریکس میں آٹھ ماہ کام کرنے کے بعد میں نے وہ کام چھوڑ دیا تھا اور ڈبوں میں گوشت بند کرنے کے ایک بوچڑ خانے میں کام شروع کر دیا۔ اصل غرض زیادہ پیسے بنانا تھا کیونکہ یہاں 8 سے 10 ڈالر فی گھنٹہ تنخواہ تھی۔ یاد رہے کہ اُن دنوں ایک کینیڈین

ڈالر 60-70 روپے کے برابر تھا اور میرا ارادہ یہی تھا کہ ایک دن پاکستان واپس جا کر اپنا خواب پورا ہوتا ہوا دیکھوں گا۔

بوچڑ خانے میں میرا کام اسمبلی لائن پر تھا۔ جس کو وہاں کام کرنے والے چین (Chain) یعنی ”زنجیر“ کہتے تھے۔ میرے ذمہ ذبح شدہ اُلٹی لٹکی ہوئی گائیوں کا گوشت آرے سے کاٹنا تھا۔ پنج بستہ کمروں میں یہ ایک انتہائی تھکا دینے والا، محنت طلب اور خون آلود کام تھا۔ گائے کے ٹپکتے ہوئے خون کے گڑھوں میں کھڑے ہو کر مجھے اپنے جسم کے تمام عضلات کو پوری طاقت کے ساتھ استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ گائے کا دودھ دوھنے سے بالکل مختلف نوعیت اور غیر صلہ مند کام تھا۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ وہی ایک کام بار بار کرنا پڑتا اور کام کرنے کی جگہ بھی انتہائی سرد تھی۔ پانچ مہینوں کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں وہ کمزور کام جاری نہ رکھ سکوں گا۔ بعض اوقات ایک چھوٹی ناکامی کسی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اگر میں تلاش جاری رکھوں، محنت کرتا رہوں اور کام ٹھیک طور سے کرتا رہوں تو ایک دن ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔

جن دنوں میں ٹیکسی چلاتا تھا، میرے دوست رمیش نے مجھے حوصلہ دیا کہ میں گورنمنٹ کے پاور پلانٹ میں کام کرنے کے لئے قدم بڑھاؤں۔ وہ خود بھی البرٹا یونیورسٹی کے پاور پلانٹ میں ایک انجینئر تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں پاور پلانٹ انجینئرنگ کا تربیتی نصابِ تعلیم شروع کروں۔ میں نے کتابیں خرید لیں، مطالعہ شروع

کیا۔ امتحان دیا۔ بآسانی پاس ہو گیا اور مجھے سرٹیفکیٹ مل گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد پاؤر پلانٹ میں ملازمت بھی مل گئی۔ وہاں مجھے 12 گھنٹوں کی شفٹ پر کام کرنا پڑتا تھا اور کئی کئی دن چھٹی رہتی اور اس طرح مجھے ٹیکسی چلانے کا وقت بھی مل جاتا، جس سے میری آمدن میں اچھا خاصہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

بعد ازاں مجھے البرٹا گورنمنٹ میں ماہر کاریگر کے طور پر ملازمت مل گئی جہاں میری پورے دن کی شفٹ ہوا کرتی تھی۔ وہاں مجھے سٹان نامی ایک شخص کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جو کہ وہاں 25 سالوں سے ملازم تھا۔ ہم دونوں کھانے کے کمرے میں اکٹھا کھانا کھایا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب وہ کھانا کھا رہا ہوتا تو روزانہ ایک چھوٹی سی نوٹ بک جیب سے نکال کر گہری نظر ڈالتا اور مسکراتا جاتا۔ آخر ایک دن میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا:

”سٹان! تم یہ کیا دیکھ رہے ہو؟ اور مسکرا کیوں رہے ہو؟“

اپنے چہرے پر ایک بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس سے جواب دیا:

”یہ میرا ریٹائرمنٹ اکاؤنٹ ہے اور 60 ہزار ڈالر کی رقم بنتی ہے!“

سٹان ایک مقامی کینیڈین تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ اُس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور مجھے بتایا کہ چند سالوں ریٹائرمنٹ کے بعد اُسکے کیا ارادے ہیں اور کیا خواب ہیں۔ اُس نے کام سے فراغت کے بعد اپنے تمام منصوبے مجھے بتائے

اور یہ بھی کہا کہ اس کا ارادہ ایک نئی والوو (Volvo) کا خریدنے کا بھی ہے۔
ایک دن سٹان نے مجھ سے بھی پوچھا کہ میری کیا خواہش تھی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد
میرے پاس کتنی رقم جمع ہو چکی ہو؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے جواب دیا کہ اگر
میرے پاس ایک لاکھ ڈالر جمع ہو جائیں تو میں ریٹائر ہو جاؤنگا۔ اور باقی تمام زندگی
مزے سے گزاروں گا۔ اُس وقت یہی میرا سب سے بڑا خواب تھا۔
لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ میرا مستقبل ایک غریب دیہاتی بچے کے خواب سے کس قدر
زیادہ آگے نکل جائیگا کہ جسکی بسر اوقات گرد آلود راستوں والے ایک معمولی سے گاؤں
میں ہوئی تھی اور وہ راستے بالآخر اُسے امریکہ کے تیل اگلنے میدانوں میں لے آئیں
گے۔

1976 میں ایک کینیڈین ساہوکار جس کا نام برنارڈ (برنی) لاف چک تھا، گھر گھر جا
کر برتن بیچنے کے کاروبار میں بہت ترقی کر رہا تھا۔ اس کی کمپنی کا نام 'ورلڈ وائیڈ
ڈسٹریبیوٹرز' (Worldwide Distributers) تھا۔ اور وہ بلا واسطہ لوگوں کے گھروں
میں جا کر کھانا پکانے کے برتن اور چینی کی رکابیاں بیچنے کے کام پر مرکوز تھی۔ اس کی
مصنوعات میں 'کوئین این' (Queen Anne) کے برتن خاص طور پر مشہور تھے۔
ایڈمانٹن جنرل اخبار میں اُس کمپنی نے ایک اشتہار دے رکھا تھا:

”اچھی بڑی کمائی والے زور آور سیلز مین فوری طور پر درکار ہیں۔“

مجھے وہ اشتہار بہت پسند تھا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ کام میں کیسے حاصل کر سکتا

ہوں جس سے میں بہت زیادہ دولت کما سکوں!

میرے دوست خالد صہبائی اور میں نے وہاں نوکری کی درخواست دے دی اور ہم دونوں کو بطور سیلز مین بھرتی کر لیا گیا۔ ہماری آمدن کمیشن کے طور پر ادا ہونی طے پائی۔ ہم دونوں ہی برتن بیچنے کے کام میں اچھے ثابت ہوئے۔ اُس کمپنی کی ایڈمنٹن کی شاخ کا مینیجر ایک ہوشیار نوجوان آر نی ولیمز نامی تھا۔

مجھے اُس کام کا کچھ بھی تجربہ نہ تھا، لیکن جلد ہی مجھے اچھی طرح کام کرنے کا سلیقہ آ گیا اور میں نے ایڈمنٹن کے گرد و نواح میں بسنے والوں کے مکانات اور پارٹمنٹوں کی پہچان کر لی جہاں اکیلی نوجوان لڑکیاں یا شادی شدہ جوڑے رہا کرتے تھے۔ میں وہاں جا کر اُن کے دروازے کھٹکھٹاتا اور بہت آسانی کے ساتھ اُس علاقے میں کھانا پکانے اور کھانے کے برتن بیچ آتا۔

گا بھوں کو دکھانے کے برتنوں سے بھرا ہوا ایک صندوق ہر وقت میری کار میں رہتا۔ میں لوگوں کے دروازے پر جا کر آہستہ سے دستک دیتا اور دروازہ کھلنے پر میرا فروخت کا کاروبار شروع ہو جاتا۔ گھر کی مالکن جیسے ہی دروازہ کھولتی تو میں بڑے مؤدبانہ رنگ میں اُس سے پوچھتا:

”میڈم! کیا آپ مُفت میں ہوائی کی سیر کرنا پسند کریں گی جس کے

ہوائی جہاز اور ہوٹل کے تمام اخراجات ادا کر دیئے گئے ہوں؟“

یہ کہتے ہوئے میں اُس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا نیلے رنگ کا اشتہار تھما دیتا جس

پر لکھا ہوتا: ”مفت میں ہوائی کی سیر۔“ وہ اس پیشکش پر اس قدر خوش ہوتی کی مجھے فوراً گھر کے اندر آنے کی اجازت مل جاتی۔ اُس کے بعد کا کام آسان تھا۔

میں آہستہ آہستہ گفتگو کو برتنوں کے موضوع پر لے آتا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے تیزی سے کام کرنا ہے اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر سامان فروخت کرنا ہے۔ لاف چک کی فرم نے اچھی طرح ہمیں تیار کیا تھا اور مجھے فروخت کرنے کی اعلیٰ مہارت حاصل تھی۔ میں لوگوں کو خریدار بنانے کے لیے کئی خود ساختہ باتوں سے کام لیتا۔ مثلاً میں چینی کے برتنوں اور گلاس کے کناروں کو اپنی انگلیوں سے ہلکا سا مارتا تو ”ٹنگ“ کی صدا بلند ہوتی اور میں کہتا کہ دیکھو، کتنے کمال کے برتن ہیں! پھر گلاس کے برتنوں پر اپنی انگلیاں پھیرتا تو ایک بڑی ہمواری آواز نکلتی جس کو سُن کر میرے اکثر گاہک اگر خریدنے پر تیار نہ بھی ہوتے، کافی متاثر ضرور ہوتے۔ پھر میں انہیں کہتا کہ اُن کے موجودہ برتن بہت سی بیماریوں کا باعث بن سکتے ہیں اور اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ یہ سُن کر وہ میرے گاہک بن جاتے اور مجھ سے نئے برتن خرید لیتے۔

کبھی کبھی میری تمام باتیں بے اثر ثابت ہوتیں اور ہوائی کی سیر کی مفت پیشکش بھی رائیگاں جاتی اور لوگ نفی میں جواب دے دیا کرتے۔ لیکن میں نے انکے انکار کو کبھی بھی ذاتی طور پر نہیں لیا اور اگلے امکانی گاہک کی طرف نکل جاتا۔

اس طرح مجھے گھر گھر جا کر سامان فروخت کرنے میں کافی مہارت حاصل ہو گئی۔ مجھے \$499 کی کل قیمت فروخت پر \$100 کمیشن کی رقم ملتی تھی۔ میں جتنے زیادہ برتن

بیچتا، اتنی ہی زیادہ میری آمدن ہو جاتی۔ میری سیلرز کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور برنی لاف چک سمیت کاروبار کے تمام افسرانِ بالا میری ترقی کے معترف ہو گئے اور جلد ہی میں سب سے بڑا سیلزمین بن گیا۔ کیونکہ کھانے کے برتن فروخت کرنے کی تراکیب کو میں نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔

نتیجۂ ایک دفعہ برنی لاف چک بذریعہ ہوائی جہاز مجھے اپنی کارپوریشن کے ہیڈ کوارٹرز لے گیا جو کہ وِنی پیگ کے شہر میں واقع تھا۔ اُس نے مجھے اپنا دفتر دکھایا اور اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھے باور کروا رہا تھا کہ میں اپنی ہنرمندی سے مستقبل میں بہت کچھ حاصل کر سکتا ہوں اور اُس کی کمپنی میں ایک مینیجر کی حیثیت سے کافی ترقی کر سکتا ہوں۔ مینیجر کا عہدہ قبول کرنے کی پیشکش میرے لئے کافی نفع بخش تھی۔ یعنی جب بھی میرے ماتحت کام کرنے والے کمپنی کا سامان فروخت کریں گے تو ان کی قیمتِ فروخت کا ایک حصہ خود بخود مجھے مل جایا کرے گا۔ اور یہ آمدن میرے ذاتی فروخت کردہ اشیاء سے حاصل کردہ کمیشن کے علاوہ ہوگی۔ اُس وقت تک میری سوچ کنوئیں کے ایک مینڈک کی طرح تھی اور دُور مستقبل میں فتحیابی حاصل کرنے کی ابھی مجھ میں خود اعتمادی نہ تھی اور مجھے اپنے پوشیدہ جوہر کا زیادہ علم نہ تھا۔

لاف چک مجھے ایک سمندر دکھا رہا تھا مگر میری نظر ابھی تک کنوئیں کے اندر تک ہی محدود تھی۔ مگر میری یہ کیفیت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ ایک کامیاب سیلزمین بننے میں برتنوں کا بیچنا میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا اور لین دین کی گفتگو کرنے کی مہارت بھی

بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے خود اپنا کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ خالد، رمیش اور میں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم تینوں برتن بیچنے کا اپنا کاروبار شروع کریں گے اور ہم نے کسی دوسری جگہ سے برتن خریدنے شروع کر دیے اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع میں ہم تینوں برابر کی حصہ داری پر متفق ہو گئے۔

بد قسمتی (یا خوش قسمتی) سے اس تین طرفہ حصہ داری میں میری دلچسپی جلد ختم ہو گئی کیونکہ مجھے احساس ہوا کہ دوستوں کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار کرنا درست فیصلہ نہیں اور آج تک میں اسی خیال پر کاربند ہوں۔ اس کے علاوہ یہ نیا کاروبار میرے مستقبل کے منصوبوں کے لئے بھی کوئی خاص مدد ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ میری طبیعت تجارت کرنے کی طرف راغب ہو گئی، جس کا میں بہت ہی ممنون ہوں۔ اپنا کاروبار شروع کرنے میں مجھے بہت ساری مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اُن میں سے ایک واقعہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

1970ء میں میں اپنے ایک دوست محمود کے ساتھ ایک بینک گیا تا کہ وہاں سے ایڈمنٹن میں ایک گیس سٹیشن خریدنے کے لئے قرضہ حاصل کیا جائے۔ ہم جب بینک پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور ہمیں بتایا گیا کہ بینک کی مینجر کھانا کھانے باہر گئی ہوئی ہے اور کچھ دیر کے بعد آئیگی۔ اس لئے ہم دونوں بھی ایک قریبی ریسٹورینٹ میں کھانا کھانے چلے گئے۔ محمود کو پینے پلانے کا بھی شوق تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے پسند کی بیئر کی ایک بوتل خریدی اور پینا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ قدرے خمار میں آنے

لگا۔ کھانا کھانے کے بعد جب ہم واپس بینک پہنچے تو صاف نظر آ رہا تھا کہ محمود نشہ کی حالت میں ہے اور کسی معنی خیز گفت و شنید کے قابل نہیں۔ اُسکی آنکھیں سُرخ تھیں باتیں ناقابلِ فہم اور اُس سے سیدھا چلنا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔

میں نے بینک مینیجر سے گفتگو شروع کی لیکن تھوڑی ہی دیر میں محمود نے جو کہ اُس وقت تک خاموش بیٹھا ہوا تھا، دخل اندازی شروع کر دی اور بینک کی مینیجر سے پیشاپ خانے کا راستہ پوچھا جو کہ اُس وقت کے لحاظ سے ایک غلط اور نامناسب بات تھی، کیونکہ اُن دنوں عام طور پر بینک والے باہر کے لوگوں کو اپنا پیشاپ خانہ استعمال نہ کرنے دیتے تھے۔ میں نے جان لیا کہ محمود کی اس غیر مہذبانہ حرکت سے قرضہ حاصل کی بات چیت ختم ہو چکی ہے اور ہمیں بینک مینیجر نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا۔

جب ہم بینک سے باہر نکلے تو مجھے محمود پر غصہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُس نے تو صرف پیشاپ خانہ جانے کی اجازت مانگی تھی، اس پر اُس نے قرضہ دینے سے کیوں انکار کر دیا! کچھ عرصہ بعد محمود نے مجھے رائے دی کہ میں عزیز سے مطلوبہ رقم ادھار حاصل کر لوں۔ لیکن میرے بھائی نے ہنسی میں اُس بات کو ٹال دیا اور مجھے کہا:

”میرا دماغ خراب نہیں کہ میں تم کو قرضہ دوں اور محمود اس کو ضائع کر

دے!“

اس طرح میرا وہ خواب ختم ہو گیا۔ محمود سے وابستہ میرے پاس کئی خوشگوار یادیں بھی ہیں کیونکہ وہ ایک زندہ دل اور مزاحیہ انسان تھا۔ اُس کے ساتھ دوستی کا یہ فائدہ

تھا کہ دنیا داری میں ڈوبی ہوئی میری شخصیت میں ایک رنگ آ جاتا تھا۔
 کینڈا میں ابتدائی سالوں کے دوران مجھے پاکستان کی یاد تک کرتی رہتی اور یہی
 جی چاہتا تھا کہ کچھ رقم جمع ہو جائے تو میں ایڈمنٹن چھوڑ کر واپس وطن چلا جاؤں۔ میں
 یوں بھی بہت کفایت شعار تھا۔ گھریلو ضروریات کے لئے ہم سستا ترین کوشت
 خریدتے۔ گھر میں تھوڑا سا کم قیمت فرنیچر تھا اور بازار سے ہمیشہ ارزاں قیمت کی چیزیں
 خریدا کرتے۔

مختلف ذرائع سے پیدا کی جانے والی اپنی آمدن کو بڑھانے کے لئے میں نے
 پرانی کاروں کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ کاروں کی فروخت سے ملنے
 والی رقم کو میں محفوظ رکھتا۔ شروع ایام میں میں اپنی آدھی تنخواہ اپنے والد کو پاکستان بھیج
 دیا کرتا تھا۔ اپنے وطن میں ہونے والے واقعات سے باخبر رہنے کے لئے میں خط و
 کتابت کرتا اور الفضل پڑھتا جو کہ مسلم جماعت احمدیہ کا اخبار تھا۔

مجھے اپنے بھائی عزیز پر قدرے رشک بھی آتا تھا کیونکہ اُس کی زندگی مجھ سے
 مختلف تھی۔ وہ ایڈمنٹن کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ساتھ بسا اوقات کرتا تھا اور اُس کے
 دوست احباب سب پڑھے لکھے اور دولت مند لوگ تھے۔ ایڈمنٹن میں وہ میری نسبت
 بہت زیادہ عرصہ سے رہ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارا آپس میں ملنا جلنا کم ہوتا
 گیا۔ اور بعد میں عزیز کی لگری چلا گیا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے میں نے پاکستان سے آنے والے مہاجرین سے دوستی

بنانی شروع کر دی جو کہ احمدی مسلمان تھے۔ جماعت احمدیہ کینیڈا کا صدر مقام ٹورانٹو میں تھا۔ جب کوئی احمدی ایک جگہ سے کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہوتا تو وہ دوسرے احمدیوں کو اس نقل مکانی کی اطلاع کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح ہر جگہ انکا باہمی تعلق قائم رہتا۔

اُن دنوں ایڈمنٹن میں کوئی احمدی مسجد نہ تھی لیکن پھر بھی ہر جمعہ کے روز نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے ہم سب اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ کوئی ایک مخصوص جگہ متعین نہ تھی۔ جمعہ کی نماز کا ادا کرنا بھی روایتی طریق سے قدرے ہٹ کر تھا کیونکہ خطبہ سننے کے لئے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی کمرے میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اُن کے لئے الگ الگ جگہوں پر بیٹھنا ممکن نہ تھا اور اُن کے درمیان کوئی پردہ یا چلن بھی آویزاں نہ ہوتی۔ خواتین مردوں کے پیچھے صفیں بنا کر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ جماعت کے ساتھ میل ملاپ رکھنا میرے لئے اہم تھا کیونکہ اس طرح میرا اپنے ماضی سے تعلق بھی قائم رہتا تھا۔

جمعہ کی شام کو احمدی خواتین پیزا بناتیں، اور ہم کسی کے گھریا پارٹمنٹ میں اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ اُن دنوں 'باسٹن پیزا' مقامی طور پر بہت ہر دلعزیز تھا لیکن ہم میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ بازار سے قیمتی پیزا خرید کر کھاتے۔ اس لئے ہم آٹا، پنیر اور قیمہ خرید کر خود ہی اپنے گھروں میں پیزا بنالیا کرتے تھے۔

ہم جب اکٹھے ہوتے تو پاکستان اور ہندوستان کی سیاست پر خوب بحث ہوتی۔ پیزا کھاتے اور اپنی باہمی محبت استوار رکھتے۔ روزمرہ زندگی سے پرے ہٹ کر

احمد یوں کا اس طرح اکٹھے ہونا ایک خوشگوار ماحول پیدا کر دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی عام طور پر میری توجہ ایڈمنٹن میں کمائی کرنے، بحث کرنے اور کچھ رقم پاکستان بھیجنے پر مرکوز رہتی تھی۔ مجھے کامیاب خرید و فروخت کرنے میں خوب لطف آتا، خصوصاً پرانی کاریں بیچنے میں۔ جب بھی مجھے کوئی منافع ملتا تو دل چاہتا کہ وہ کام کرتا چلا جاؤں۔ اس طرح میں اشیاء فروخت کرنے اور نفع کمانے میں ماہر ہو گیا تھا، ہاں کبھی کبھی مجھے ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا۔ لیکن ہر ناکامی سے میں کچھ نہ کچھ سبق سیکھ لیا کرتا تھا۔

اس دوران عزیز بھائی اپنی ترقی کے زینوں پر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے ایک نئی آبادی مل وڈ نامی میں ایک بالکل نیا تعمیر شدہ مکان خرید لیا اور اُس مکان کو خریدنے کے لئے اُس نے 40 ہزار ڈالر ادا کئے جو کہ اُس وقت ایک خاصی بڑی رقم تھی۔ اُس مکان کی خرید پر ہم سب نے خوشیاں منائیں۔ اور میں نے اُس مکان میں ایک گیراج بنانے میں اُس کی مدد بھی کی۔

میرے دل میں کچھ رشک بھی پیدا ہونا شروع ہوا اور میں بھی اپنے لئے ایک مکان خریدنے کا خواہش مند ہو گیا۔ اُس رشک نے مجھے عمل کرنے کی طرف ابھارا اور میں نے بھی دس ہزار ڈالر سے کم قیمت پر ایک ٹاؤن ہاؤس خرید لیا جو کہ اُسی علاقے میں عزیز کے گھر سے کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ اُس کی اوپر والی منزل میں سونے کے لئے تین کمرے تھے اور نیچے تہ خانہ بھی تھا۔ میرے بھائی نے تو کینیڈا میں رہنے کے ارادے سے گھر خریدا تھا، مگر میں نے اپنا مکان فوری منافع کمانے کے لئے خریدا تھا اور جون

1975ء میں میں 22 ہزار ڈالر پر اپنا ٹاؤن ہاؤس فروخت کر کے تقریباً 10 ہزار ڈالر بنائے۔ اور وہ تمام رقم پاکستان جا کر دھوم دھام سے خرچ بھی کر ڈالی اور کنگال ہو کر کینیڈا واپس لوٹ آیا۔ لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے واپس پاکستان جا کر وہاں رہائش اختیار کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

پاکستان کی حکومت نے 1974ء میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا جس کے نتیجے میں میں اپنے ملک میں رہتے ہوئے بھی خود کو ایک پردیسی محسوس کرتا تھا۔ میں نے ایک سال کے بعد کینیڈا کی شہریت حاصل کر لی اور پختہ ارادہ کر لیا کہ کینیڈا میں مستقل رہائش رکھوں گا اور مزید دولت کمانے کی راہ پر گامزن رہوں گا۔ اب جو میں مُڑ کر دیکھتا ہوں تو آج کے مقابلہ میں وہ رقم بہت تھوڑی تھی۔ لیکن اُس وقت زندگی گزارنے کا میرا تجربہ بھی محدود تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ بہت بڑی رقم ہے۔

کچھ عرصہ بعد ہم ایڈمنٹن کے ایک دوسرے نواحی علاقے میں منتقل ہو گئے جس کا نام کلیئر ویو تھا۔ میرا کام بھی اچھا تھا اور کار بھی نئی تھی جو کہ سفید رنگ کی مونٹی کارلو تھی جس کا اندرون نہ سُرخ رنگ کا تھا اور زندگی خوشگوار تھی۔

جس وقت میں کینیڈا میں داخل ہوا تھا تو میری جیب میں فقط 30 ڈالر تھے۔ لیکن چند سالوں کے اندر ہی میں درمیانی طبقہ کے لوگوں کی ٹھوس زندگی کے مزے لے رہا تھا۔ آرام دہ مکان تھا اور دو بچے بھی تھے۔ اب آہستہ آہستہ میرے ذہن سے پاکستان کی یاداشت گم ہونا شروع ہو گئی۔ کینیڈا کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو پیش

خدمت ہے:

ایڈمنٹن میں ہماری رہائش کے شروع ایام کے دوران 1970 کی دہائی کے آخری سالوں میں بُشریٰ ایک بڑے عالیشان ’فوریسینز‘ کے نئے ہوٹل میں برتن دھونے کا کام کرتی تھی۔ آجکل اُس ہوٹل کا نام ’سٹن پلیس ہوٹل‘ ہے (Sutton Place Hotel) وہ ہوٹل ایڈمنٹن شہر کے عین وسط میں واقع تھا اور ایڈمنٹن سٹی سینٹر مال کے قریب تھا اور اُن دنوں وہاں تک پیدل چل کر جانا آسان تھا۔

بُشریٰ کے لئے برتن دھونے کا کام کافی مشکل تھا کیونکہ اُس کو سارا دن کھڑا رہنا پڑتا تھا اور برتن دھونے کی مشین کو دیر تک چلائے رکھنا ضروری تھا اور ہوٹل کے مینیجر اُس کے ساتھ اور دوسری مہاجر عورتوں کے ساتھ جو کہ وہاں کام کرتی تھیں نہایت بدسلوکی کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔

کئی سالوں کے بعد میں بُشریٰ اور بچوں کو لیکر ایڈمنٹن آیا اور اُسی ہوٹل میں ایک بڑا شاندار کمرہ کرایے پر لیا اور میں نے بُشریٰ سے پوچھا:

”اب یہ کیسا لگتا ہے؟“

جواباً وہ مُسکرا دی!



تجاہلِ غیر عارفانہ

اب قارئین کو تیل اور گیس کی تلاش کی داستان سنائی جائے گی کہ جس میدان میں مکمل لاعلمی کے باوجود قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

1970 کی دہائی میں مجھے طرح طرح کے کام کرنے کا اچھا خاصہ تجربہ ہو گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی چلائی، گھر گھر جا کر برتن بیچے، گوشت کاٹا، پرانی کاریں فروخت کیں، چوکیداری کی اور حکومت کے کارندے کے طور پر بھی کام کیا۔ اس طرح نوع بہ نوع کام کرنے کے بعد میں دنیا کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن کیا دنیا بھی میرے لئے تیار تھی؟

1979 کی گرمیوں کے ایک تابناک دن مجھے عزیز کا فون آیا۔ وہ ڈینور میں تھا اور وہ وہاں ایک ایسی کمپنی کے مالکان سے ملنے گیا تھا جو پودے لگانے کے ایسے آلات فروخت کرتی تھی جو پودوں کو از خود پانی بھی دیتے تھے۔

عزیز نے شلم برگر سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لینے کے بعد اُس کمپنی کا ایک شانچہ خریدنے میں خاصی رقم لگا دی تھی۔ لیکن اُس کا یہ نیا کاروبار سخت نقصان میں جا

رہا تھا اور درجنوں آلات اُس کے گھر کے پیچھے کے احاطہ میں بے کار پڑے ہوئے تھے جنکا کوئی خریدار نہ تھا۔

عزیز سخت مجبوری کی حالت میں اُس کا روبار سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ ڈینور میں قیام کے دوران اتفاقاً اُس کی نظر اخبار کے ایک اشتہار پر پڑی جس میں لکھا تھا کہ کینساس میں چنوٹ کے علاقہ میں گیس اور تیل کے کنوؤں کے لئے خریدار مطلوب ہیں۔ چونکہ عزیز اُن دنوں کافی پریشان تھا اور تیل اور گیس کی صنعت میں دوبارہ واپس آنا چاہتا تھا۔ اُنہی ایام کے دوران کینیڈا میں کیلگری اور وینکوور کے علاقوں میں لوگ تیل اور گیس کے کنوئیں خرید رہے تھے اور مشرقی کینساس میں ایسی زمینیں بھی کرایہ پر لے رہے تھے جہاں تیل اور گیس نکلنے کا کافی امکان تھا۔ اُس وقت ایران میں امریکی سفارت خانہ کے کارندوں کو یرغمال بنانے کے نتائج ظاہر ہو رہے تھے اور امریکہ میں ہونے والے انتخابات پر بھی لوگوں کی خاص توجہ مرکوز تھی۔ اُس کے ساتھ لوگوں کا رجحان تیل کے کنوئیں خریدنے یا متعلقہ زمینیں کرایہ پر لینے کی طرف بڑھ رہا تھا تاکہ وہ جلد سے جلد بڑی سے بڑی رقم بنا سکیں۔

1979ء میں وینکوور میں پینی۔ سٹاک کمپنیاں ابھرنا شروع ہوئیں جن میں ایک سے پانچ ملین ڈالرز کے سٹاک خریدنے پڑتے تھے۔ اور اُن تمام کمپنیوں کی نظریں کینساس میں رقمیں لگانے پر مرکوز تھیں۔

پینی۔ سٹاکس چھوٹی عامہ کمپنیوں کی حصہ دار ہوتی ہیں اور کم قیمت پر حصے فروخت

کرتی ہیں۔ موجودہ صورت میں وہ حصہ داروں سے رقم وصول کر کے تیل اور گیس کے کنوئیں خرید رہی تھیں اور ایسی زمینیں کرایہ پر لے رہی تھیں جہاں سے تیل اور گیس کا نکلنا متوقع تھا۔ اگر سودا ٹھیک ہو جاتا تو وہ خوب پیسے بناتیں اور سٹاک کی قیمتوں میں اضافہ کر کے مزید حصہ داروں کو آملنے کی دعوت دیتیں۔

مجھے براہ راست خرید و فروخت کا خاص ملکہ تھا اس لئے عزیز نے صحیح آدمی کوفون کیا اور مجھے کہا کہ میں چنوٹ جاؤں جو کہ مشرقی کنساس میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہاں کے تیل اور گیس کے کنوؤں کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کروں اور اس بات کا بھی جائزہ لوں کہ وہاں کی زمین اور معدنیات کے مالکان سے انکی زمین کرایہ پر کیسے لیجا سکتی ہے۔ اس کاروبار میں کافی سرگرمی تھی اور کینیڈا میں اس کے کئی دلال بھی موجود تھے۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ اس کاروبار کی ابتدا سے آخر تک تمام تفصیلات کا پتہ لگاؤں۔ عزیز کی بات سن کر مجھ پر ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہوگئی اور خوشی خوشی میں نے اُس کی یہ پیشکش قبول کر لی۔

عزیز نے اخباری اشتہار میں لکھا ہوا فون نمبر بھی مجھے دیا اور اُس کا خیال تھا کہ ہم دونوں کو مل کر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور دونوں منافع میں برابر کے حصہ دار ہوں گے اور اس کے لئے فوری قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میں ایک اچھا سیلزمین تھا اور سب سے مشکل ترین کام یعنی گھر گھر جا کر اشیاء فروخت کرنے میں ماہر تھا۔ مزید یہ کہ میں انجان لوگوں کے ساتھ فون پر بات چیت کرنا بھی جانتا تھا اور ایڈمنٹن میں برتن

فروخت کرنے کے دوران اس کا کافی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔

فون پر عزیٰ کی پیشکش پر میں نے ایک زوردار حامی بھری اور کہا کہ ہاں میں یہ کام کرنے پر تیار ہوں اور کینساس فون کال کر کے تیل کے کاروبار کے متعلق معلومات حاصل کیں اور بھائی کو یہ بھی بتایا کہ میں خود کینساس جا کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ مجھے تیل کی زمین کرایہ پر لینے یا تیل اور گیس کے کنوئیں کھودنے کا کچھ بھی تجربہ نہ تھا، لیکن میں زندگی میں کوئی بھی اچھا کام کرنے کے لئے ہمیشہ تیار تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے گھر گھر جا کر برتن بیچنے کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا، نہ ٹیکسی چلانے کا کوئی تجربہ تھا۔ تو پھر اس نئے کام کو چلانے میں کیا مشکل پیش آ سکتی تھی؟

ایڈمنٹن سے میں نے اپنے کام سے تین ہفتوں کی چھٹی لی اور اگلے معرکہ مارنے کی تیاری شروع کر دی۔ ایڈمنٹن کی خوشگوار گرمی کا موسم چھوڑ کر میں جون 1979ء میں چنوٹ، کینساس آ گیا جو کہ ایک وسیع میدانی علاقے کے عین وسط میں تھا۔ اور یہ علاقہ کینیڈین سرزمین کی اونچ نیچ سے کہ جسے دیکھنے کا میں عادی ہو چکا تھا، بالکل مختلف تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ میرا پہلی بار آنا تھا، جس نے میری زندگی ہمیشہ کے لئے بدل کر رکھ دی۔ میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کہ جسکے مالکان ہندوستانی تھے، ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں ایک ایسے قصبہ میں آیا ہوں جہاں کے لوگوں کی اکثریت زمینداری اور مویشی پالنے کا کاروبار کرتی ہے۔ میں کار میں اُس چھوٹے سے قصبہ میں ادھر ادھر گھومتا رہا اور وہاں کی شاہانہ

عدالت اور صدیوں پرانی مضبوط عمارات کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا جو کہ قصبے کے وسط میں تعمیر کی گئیں تھیں۔ شہر کے عین درمیان ایک چوراہا تھا جو آواز بلند اعلان کر رہا تھا کہ وہ جگہ مصروف ترین جگہ تھی۔ عدالت کی خوشنما عمارت کے ارد گرد بڑے بڑے سرسبز و شاداب گھاس کے میدان پھیلے ہوئے تھے۔

چنوٹ میں میں ادھر ادھر ڈرائیو کر رہا تھا کہ مجھے تیل کے اوزاروں کی ایک دکان نظر آئی اور میں متحسّس ہو کر اُس کے اندر چلا گیا۔ اُس دکان کے مالک کا نام جیک فیلیس تھا جو کہ میانہ عمر باتونی آدمی تھا اور وہ تیل نکالنے کے مستعمل آلات فروخت کرتا تھا۔ بات کرتے وقت اُسے گندی زبان استعمال کرنے کی بھی عادت تھی اور وہ مقامی طور پر تیل کھودنے کے میدان میں کافی ہر دلعزیز شخص تھا۔ اُس کی دکان کے سامنے ایک مصروف گیس اسٹیشن بھی تھا جہاں میری ملاقات آدم نامی ایک شخص سے ہوئی اور اُس جیسا باہمت، خوشدل اور ہوشیار ملازم میں نے اُس سے پہلے اپنی زندگی میں کم ہی دیکھا تھا۔ اُس کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا، لیکن وہ ایک ہی ہاتھ کے ساتھ بہت تیزی کے ساتھ کام کرتا اور انتہائی سرعت کے ساتھ ٹرکوں میں گیس بھرتا۔ تیل کی سطح کا اندازہ لگاتا، ٹائروں میں ہوا کے دباؤ کا اندازہ لگاتا اور اسی طرح کے اور بہت سارے کام بڑی مہارت سے سرانجام دیتا۔ اُس نے میرے چنوٹ کے قیام کے دوران اُس علاقے کے بہت سے زمینداروں کے پتے بھی دیئے۔ اُس کو ہر وقت خوشباش، ہوشیار اور محنت سے کام کرتا ہوا دیکھ کر میں حیران رہ جایا کرتا تھا۔

چنوٹ سادہ اور دوستانہ طبیعت کے زمینداروں سے بھرا پڑا تھا۔ اُن میں اکثر بہت مخلص عیسائی تھے اور اُن کا اتوار کا دن زیادہ تر گرجوں میں گزرتا تھا۔ وہ خیر اندیش، نرم دل اور خوش اخلاق لوگ تھے۔ پاس سے گزرنے والوں کو وہ ہاتھ ہلا کر سلام کرتے اور سڑک پر کاریں بھی آرام سے چلاتے۔ انکے مقابل کینیڈا میں بعض ڈرائیور بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے اور زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیتے تھے۔ کینیڈا میں ڈرائیور عام طور پر غصے اور بد مزگی کا اظہار کرتے۔ مگر یہ بات چنوٹ میں دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ چنوٹ سے باہر کی دُنیا ایران میں امریکیوں کو یرغمال بنا رکھنے کے خطرناک بحران سے گزر رہی تھی۔

امریکی سفارت خانہ کے 142 امریکی شہری اور کارندے 4 نومبر 1979ء سے لے کر 20 جنوری 1981ء تک 444 دن تک یرغمال کے طور پر نظر بند رکھے گئے تھے اور ہر جگہ ایران اور امریکہ کے درمیان سفارتی تعلقات کا مدافعتانہ سکوت زیر بحث تھا۔ چنوٹ اور اُس کے قُرب و جوار کے قصبے، کہ جہاں زمینوں سے تیل نکلتا تھا، کاروباری لحاظ سے دن بہ دن لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنتے جا رہے تھے۔ اُس بحران کے نتیجے میں گیس اسٹیشنوں میں گیس کی کمی اور تیل کی قیمت میں یک دم اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اُن حالات کے زیر اثر امریکی حکومت نے اپنی سرزمین میں سے زیادہ سے زیادہ تیل نکالنے پر غور کرنا شروع کر دیا تا کہ امریکہ اس معاملہ میں غیر ملکوں پر انحصار ختم کر کے خود کفیل ہو جائے۔

زمین کے مالکان سے جب میں نے بات چیت شروع کی تو وہ میرے بارے میں کافی متحسّس تھے۔ وہ مجھ سے اکثر پوچھتے کہ میں کہاں سے آیا ہوں، جب میں انکو بتاتا کہ میں کینیڈا سے آیا ہوں تو وہ مجھ پر اعتبار نہ کرتے اور مزید دریافت کرتے کہ کیا میں سچ مچ کینیڈا سے ہوں؟ تو میں ان کو سمجھاتا کہ دراصل میرا پہلا وطن پاکستان تھا۔ میرے اس جواب پر میں نے چند بار مالک زمین کو اپنی بیوی سے یہ پوچھتے ہوئے سنا:

”جانِ من، یہ کون سا ملک ہے؟“

اُس زمانے میں امریکہ میں بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ دنیا کے نقشے پر پاکستان کہاں ہے؟ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شک بھی گزرتا ہو میں کوئی امیر ایرانی جاسوس ہوں جو اُن کی ساری زمینیں خریدنے کے چکر میں ہوں۔

چنوٹ کے قریب بعض چھوٹے چھوٹے قصبے بالکل الگ تھلگ واقع تھے، جیسے لولا، ہمبولٹ اور پیولا۔ وہاں کے لوگ بے حد مذہبی تھے، اور اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو جانتا تھا۔ اُن کی تمام زندگی فصلیں اُگانے اور مال مویشی پالنے میں گزر جاتی۔ اور اگر وہ کوئی کاروبار کرتے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہی کرتے۔ اُن میں سے کئی لوگوں کو میرا اُن کے درمیان موجود ہونا اچھا نہ لگتا تھا۔ کیونکہ میں اپنی کاؤبوائے ہیٹ، مونچھوں اور عجیب سے تلفظ کے ساتھ ان کو بالکل غیر ملکی باشندہ دکھائی دیتا تھا۔

میرا مقصد تھا کہ ان زمینوں کو کرایہ پر لے کر آگے رقم لگانے والے کینیڈین کو دوں

اور ہمارا باہمی ناٹھ اُن زمینوں کے نیچے پوشیدہ تھا، یعنی تیل۔ مجھے زمین درکار تھی اور انکو رقم اس واسطے ایک سادہ سا اقرار نامہ ہم دونوں کو دولت مند بنا سکتا تھا۔

اُس میدانی بے آباد زمین کو میں گھنٹوں کھڑے ہو کر دیکھتا رہتا تھا۔ جب میں دیہاتی علاقے میں ادھر ادھر ڈرائیو کرتا تو ہر میل دو میل کے فاصلے پر مجھے غلے کے گودام اور مویشیوں کے باڑ نظر آتے۔ اُن زمینداروں کے اپنی زمینوں پر ایک منزلہ خوبصورت مکان بنے ہوئے تھے اور وہ جدید طریقوں سے کھیتی باڑی کرتے اور بڑی بڑی مشینوں کے ساتھ اپنی فصلوں کی اُگائی، کٹائی اور پھٹکائی کرتے۔ اور یہ تمام باتیں میرے لئے بالکل نئی تھیں۔

بہر حال جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا تھا اُسکے حصول کے لئے مجھے وقت ضائع کئے بغیر فوراً کام شروع کرنا تھا۔ میں پیسے بنانے کے لئے تو تیار تھا مگر کس ترکیب سے یہ کام شروع ہوگا اُس سے مکمل طور پر نا بلد تھا۔ خیر، چنوٹ آنے کے تین دنوں کے بعد میں نے زمینداروں کے دروازوں پر دستک دینی شروع کر دی تاکہ پتہ چلے کہ وہ اپنی زمین کرایہ پر دینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ تاکہ ہم اُس زمین کی کھدائی شروع کر کے تیل نکالنے کی کوشش کر سکیں۔ اُن میں سے تو کئی لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے مگر پھر بھی وہ دوستانہ انداز میں گرمجوشی سے ملتے تھے۔

سفید فام لوگوں کے سمندر میں میں تنہا ایک سانولے رنگ کا آدمی تھا جسے دوسری نسل کے لوگوں سے گھل ملنے کے کم ہی مواقع ملے تھے۔ اکثر زمیندار مجھے غور سے

دیکھنے کے بعد پوچھتے کہ کیا میں ایرانی ہوں؟ جب میں اُن کو بتاتا کہ میں ایرانی نہیں ہوں، بلکہ پاکستانی ہوں تو وہ حیران ہو کر پوچھتے کہ پاکستانی کون ہوتے ہیں! تب مجھے اُن کو پاکستان اور ایران کے درمیان فرق سمجھانا پڑتا جس کا کہ اُنہیں قطعاً کوئی علم نہ تھا۔

ان لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کا ایک طریق یہ بھی تھا کہ اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی خاطر میں انہی کی طرح کا لباس پہنوں۔ اس لئے میں نے والمارٹ کے سٹور سے نیلے رنگ کی جینز، کاؤبوائے بوٹوں کا ایک جوڑا اور نیلے اور سفید رنگ کی دو چار خانیدار قمیضیں خرید لیں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ میری اجنبیت معدوم رہے۔ میں اُن لوگوں میں گھل مل کر رہوں اور میری پوری کوشش یہی تھی کہ وہ مجھے ایرانی نہ تصور کریں۔ اس لئے میں نے چنوٹ کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کا انداز اپنانا شروع کر دیا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ میں سفید فام تو نہیں بن سکتا اور اگر میں اُن کو ایرانی لگوں تو تیل نکالنے کے لئے زمین کا ٹھیکہ کبھی نہیں ملے گا۔ اس لئے میں نے یہ کوشش کرنا شروع کی کہ اُن کو ہسپینک نظر آؤں۔

ایک دن میں اپنی کار میں گیس ڈال رہا تھا کہ ایک میکسیکن شخص نے مجھ سے سپینش زبان میں کوئی سوال کیا۔ میں نے جواباً کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ وہ مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے کیونکہ مجھے سپینش زبان نہیں آتی۔ یہ سُن کر اُس نے ہنسنا شروع کر دیا اور مجھے کہا: ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم تو ہم ہی میں سے ہو، تو پھر سپینش میں بات

کرنے سے کیوں گھبرار ہے ہو؟“

اُس وقت میرے پاس زرد رنگ کی ایک چھوٹی سی فورڈ پٹو کار ہوا کرتی تھی جس پر میں نے اُس علاقہ کی سڑکوں پر ادھر ادھر جانا شروع کر دیا تا کہ زمینوں کے مالکان سے ملاقات کر سکوں۔ میں صبر و تحمل کے ساتھ اُن کے گھروں کے باہر کھڑے ہو کر علاقے کا جائزہ لیتا اور یہ بھی دیکھتا کہ ارد گرد کوئی حفاظتی کتے تو نہیں ہیں۔ پھر میں اُن کے دروازے پر آہستہ سے دستک دیتا اور دل میں دعا کر رہا ہوتا کہ گھر میں کوئی نہ کوئی موجود ہو جو میرے لئے دروازہ کھولے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی دروازہ کھولتا تو مجھے اپنے خلیہ اور شکل و شباهت کے پیش نظر اُن کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہوتا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے پوچھتے کہ میں اُن کے گاؤں میں کس غرض سے آیا ہوں! کبھی تو میں اُن کو کہتا کہ میں ایک تیل کی کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ اور کبھی میں کہتا کہ میں الفضل آئل اور گیس کمپنی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ الفضل جماعت احمدیہ کے مشہور اخبار کا نام ہے اور ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم اپنی سب سے پہلی آئل کمپنی کا نام بھی الفضل رکھیں گے تا کہ اس طرح اپنی روحانی بنیادوں کے ساتھ ایک مستحکم تعلق قائم رہے۔ لیکن کینساس کے لوگوں کو الفضل نام سے ایرانی یرغمال کی صورت حال یاد آ جایا کرتی تھی اور ویسے بھی وہ الفضل کا لفظ ٹھیک طرح سے ادا نہ کر سکتے تھے اور یہ نام اُن کو کچھ مشکوک سا نظر آتا تھا۔ اس طرح شروع ہی میں ہمیں یہ بات سمجھ آ گئی یہ نام یہاں نہیں چلے گا۔ اس لئے جلد ہی میں نے وہاں کے لوگوں کیلئے ایک آسان سا نام منتخب کر لیا اور ہماری کمپنی کا نیا نام ’پیٹر و امریکہ‘

(Petro America) رکھ دیا گیا۔ یہ نام اُس وقت کینیڈا کی سب سے بڑی کمپنی پیٹرو کینیڈا (Petro Canada) سے مماثلت رکھتا تھا۔ خوش قسمتی سے پیٹرو امریکہ نام رکھنے کی کینساس میں منظوری بھی مل گئی۔

اپنی اس نئی مہم کے ابتدائی چند ہفتوں میں ہی مجھے کامیابی کی مہک آنی شروع ہو گئی۔ میں پانچ مالکانِ زمین سے ملا تھا اور اُن میں سے ایک یا دو نے مجھے ٹھیکہ پر زمین دینے میں دلچسپی کا اظہار کر لیا۔ اس دوران میری ملاقات ایک شخص لیو آٹکینز (Leo Atkins) سے ہوئی جو کہ ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا، بھاری بھر کم جسم والا ایک معزز مالکِ زمین تھا۔ اُس کی رہائش ٹیکساس میں لولا قصبے کے قریب تھی۔ اُس سے ملتے ہی ہم دونوں کے درمیان باہمی اعتماد پیدا ہو گیا۔ وہ ایک بااخلاق، مہربان انسان تھا۔ اُس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اپنی حسین بیوی سے متعارف کروایا اور اپنی زمین مجھے ٹھیکہ پر دے دی۔

اُس نے مجھے اُس علاقے میں دوسرے مالکانِ زمین سے بھی تعارف کرایا۔ وہ مجھے 'جو نا' کہتا تھا کیونکہ میرے اصلی نام 'یونس' کے بالمقابل اسکو جو نا کہنا آسان تھا۔ اگر اُس وقت وہ مجھے 'ادنے' کہہ کر بھی پکارتا جس کے ساتھ مجھے دولت ملنی شروع ہو جاتی تو وہ نام بھی مجھے قبول تھا۔

لیو پہلا مقامی مالکِ زمین تھا جس نے مجھے تیل اور گیس کے کاروبار میں کامیابی کے قدم اٹھانے سکھائے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مقامی زمینداروں سے کیسے بات چیت

کرنی چاہیے اور اُن کو راضی کرنے کے کیا طریقے ہیں اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے کئی گُر بھی سکھائے۔ اُس کی دانائی سے پُر نصیحتیں میرے کاروبار کا مستقبل سنوارنے میں ایک انمول اثاثہ ثابت ہوئیں اور اُس وقت مجھ پر منکشف ہوا کہ کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مضبوط تعلقات قائم کرنا کتنا ضروری ہے۔

اُس کی صحبت میں میرے اندر مزید خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور میں نے جان لیا کہ میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتا ہوں۔ اُن کے ساتھ بھی جو مجھ سے بالکل مختلف ہوں۔ میں نے یہ جان لیا کہ اکثر لوگ فقط باہمی تعلقات ہموار رکھنا چاہتے ہیں اور میں اُن کے لئے درمیانی رابطے کا کام بآسانی کر سکتا ہوں۔

کینساس کے اکثر زمیندار آسودہ حال اور نرم دل لوگ تھے۔ اُن میں سے بعض عیسائی واعظ بھی تھے لیکن اُن میں سے کسی نے بھی میرے مسلمان ہونے کی بناء پر میرے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُن دنوں کینساس میں کسی کو بھی اسلام کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ اُن میں سے اکثر مجھے ایرانی سمجھ کر مجھ سے پوچھا کرتے تھے:

”تم لوگ تو ہم سے زیادہ امیر ہو۔ تو یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

لیکن میری یہی متواتر کوشش رہی کہ اُن لوگوں کے ساتھ گھل مل کر اچھے روابط قائم کروں، اُن کا اعتماد حاصل کر سکوں اور اُن کے ساتھ اچھے کاروباری تعلقات استوار کر لوں۔

لیو مجھے اپنے گھر کھانے کی دعوت پر بلاتا اور کھانا شروع کرنے سے پہلے وہ اور اس کی بیوی میرے ہاتھ پکڑ کر شکرانے کے طور پر دعا کیا کرتے تھے۔ مجھے اُن کا یہ انداز بہت اچھا لگتا تھا، کیونکہ اس سے قبل تمام زندگی مجھے کھانا شروع کرنے سے پہلے اس طرح اجتماعی دعا کا کبھی کوئی تجربہ نہ ہوا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے اپنے ٹرک میں بیٹھا کر دوسرے زمینداروں کے گھروں میں لے جاتا اور اُن سے میرا تعارف کرواتا۔ لیو ایک اچھا اور پکا دوست ثابت ہوا۔ اُس کی دوستی کے حوالے سے مجھے دوسرے زمینداروں سے گفتگو کرنے میں سہولت رہتی۔

مجھے مالکان زمین سے گفت و شنید کرنے میں مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ اور اگر پہلی بار بات نہ بنتی تو چند دنوں کے بعد میں دوبارہ اُن کے پاس چلا جاتا تا کہ بات کو آگے بڑھا سکوں۔ میں ثابت قدمی کے ساتھ اُن کو اپنی زمینیں ٹھیکے پر دے دینے کی ترغیب کرتا۔ مگر اُن پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنے کی کوئی چال نہ چلتا۔ لیو میرا تعارف کراتے وقت کہا کرتا تھا کہ یہ نوجوان بہت اچھا ہے اور وقت کے اعتبار سے یہی ایک بہترین تعارف تھا۔

لوگوں کو میری زرد رنگ کی پنٹو کار کی بھی پہچان ہو گئی تھی۔ جب وہ اسے اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہوتے دیکھتے تو کہتے:

”دیکھو، ٹھیکیدار شکاری کُتا آ پہنچا ہے!“

اُن کی اس بات کو میں اپنے حق میں ایک کلمہ تحسین سمجھتا تھا اور میں ثابت قدمی

کے ساتھ اپنی بات منوانے میں کوشاں رہتا تھا۔

جیسے جیسے موسم بدلتا جا رہا تھا مجھے کینساس زیادہ پسند آنا شروع ہو گیا۔ وہاں میں نے اپنے ابتدائی چند ہفتوں ہی میں مقامی مالکان زمین سے کئی زمینیں ٹھیکے پر لے لیں تھیں جن پر کینیڈین اجارہ داروں نے فوراً سودے بھی کر لئے اس طرح میری خود اعتمادی کو تقویت ملتی چلی گئی۔

اُس وقت تک میں نے نہ صرف تیل اور گیس کے ٹھیکوں کی تفصیلات کا علم حاصل کر لیا تھا، بلکہ تیل اور گیس کے نقشے پڑھنا، انکی قیمتوں کا اندازہ لگانا بھی سیکھ لیا تھا۔ اور میں مالکان زمین کے تقریباً تمام سوالات کا جواب بآسانی دے سکتا تھا۔ بعض اوقات اگر کسی بات کا مجھے علم نہ بھی ہوتا تو پھر بھی میں اپنی علمیت کا ڈھونگ رچاتا جس کا تجربہ مجھے ایڈمنٹن میں گونا گوں کام کرنے کے دوران ہو چکا تھا۔

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اب مجھے اگلا قدم اٹھانا ہے۔ اور میرا اگلا قدم یہ تھا کہ پٹرولیم کے منتظم (Petroleum Landman) کی تمام تر ذمہ داریوں پر پورا عبور حاصل کر لوں، تاکہ میں تیل اور گیس کے زخیروں، زمین کے ٹھیکوں، منافع میں حصہ داریوں اور تیل کی تلاش وغیرہ جیسے موضوعات پر معقول اور موثر گفتگو کرنے کے قابل ہو سکوں۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا مختلف باتوں کو اپنے تصور میں لاتا، ذہنی طور پر حساب کتاب لگاتا اور اپنے خیالات کا تجزیہ کرتا، تاکہ اُن مالکان زمین کو جو اپنی زمینیں مجھے

ٹھیکے پردینے میں دلچسپی رکھتے ہوں، میں مناسب اور منطقی جوابات دے سکوں۔ یہ ایک کافی مشکل کام تھا کیونکہ مجھے یہ ساری باتیں ایک محدود وقت کے اندر بہت تیزی سے سیکھنی تھیں۔ بہر حال میرا ارادہ مستحکم تھا اور پورے انہماک اور گرم جوشی کے ساتھ دن رات کام کرتا رہا اور مجھے اپنے کام سے تسلی ہو گئی۔ میری اس محنت اور جستجو کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت تھوڑی مدت میں میں نے تیل کے کاروبار کے متعلق بہت ساری معلومات حاصل کر لیں۔

میں بیدار مغزی کے ساتھ زمینوں کا معائنہ کرتا، فوری طور پر اپنا تعارف کرواتا اور ہر شخص کے انفرادی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ عام طور پر میں اپنے کسی جان پہچان والے شخص کا حوالہ دیتا اور اس طرح کسی انجان مالک زمین سے پہلی ملاقات کا تعین کرنے میں سہولت ہو جاتی۔

ملاقات کے وقت میں شروع میں اُن سے چھوٹی موٹی باتیں کرتا تا کہ وہ میری باتیں آرام سے سننا شروع کر دیں۔ لیکن جلد ہی میں گفتگو کا رُخ اُن کی زمینوں کو ٹھیکہ پردینے کی طرف موڑ دیتا۔ میں ہمیشہ اقرار نامہ کے کاغذات اپنے ساتھ رکھتا۔ اُن دنوں ہم کاربن پیپر استعمال کیا کرتے تھے تا کہ دستخط شدہ معاہدہ کی نقول میں اپنے پاس رکھ سکوں۔ جب وہ معاہدہ کرنے پر تیار ہو جاتے تو میں معاہدہ کے کاغذات پر اُن کے دستخط لیتا اور اُن کو ایک بنک ڈرافٹ دیتا جو 30 سے 60 دنوں کے اندر بھنا کر وہ رقم حاصل کر سکتے تھے۔ زمین کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے بعد میں عزیز کو کیلگری فون کرتا

اور وہ آگے اُس ٹھیکے کو کینیڈا میں روپیہ لگانے والے بیوپاریوں پر اضافی قیمت کے ساتھ فروخت کر دیتا۔

اس کاروبار میں نفع حاصل کرنے کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ بہ فرض میں کسی زمیندار سے اُس کی زمین 10 ڈالرز فی ایکڑ کرایہ پر لیتا تو میں اُس کو ایک تحریری اقرار نامہ دیتا کہ اُس کو 30 سے 60 دنوں کے اندر اُسکی رقم مل جائے گی۔ اس کے بعد عزیز اور میں اُسی زمین کو آگے 50 ڈالرز فی ایکڑ کے حساب سے کینیڈا میں اس کاروبار میں رقم لگانے والوں کو کرایہ پر چڑھا دیتے۔ اس طرح 40 ڈالرز فی ایکڑ ہم اپنے پاس بطور معاوضہ رکھ لیتے۔ جس میں میرے تمام کاموں کا معاوضہ شامل ہوتا، یعنی زمین کی تلاش کرنے کی فیس، اقرار نامے کیلئے گفت و شنید اور سودے کی تکمیل کا معاوضہ۔ اس طرح ہمیں اچھی خاصی رقم منافع کے طور پر مل جاتی۔ کیونکہ کینیڈین رقم لگانے والوں میں سے کوئی بھی یہ کام کرنے کو تیار نہ تھا جو کہ میں کر رہا تھا۔ اس کام کے لئے کینساس کے دور دراز علاقہ کی بار بار مسافرت اور اقرار نامے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ہم نے کاروبار میں روپیہ لگانے والے کینیڈین بیوپاریوں سے تیل کی فروخت سے حاصل ہونے والے منافع میں 3 فی صد کی حصہ داری کا تقاضہ کیا۔ کیونکہ اُن کا کاروبار کرایہ پر لی گئی زمین کھود کر وہاں سے تیل اور گیس نکالنا تھا اور ہمارے پیسے بنانے کا یہ ایک بہترین ذریعہ تھا۔ یعنی جب کنوؤں میں سے

نکالے گئے تیل اور گیس کی فروخت شروع ہو جائے گی تو ہمیں متواتر منافع ملتا رہے گا۔

درحقیقت کینیڈا کے قوم لگانے والوں کی اکثریت اُس زمین کی کھدائی کا کام شروع نہ کرتے تھے جو انہوں نے کرایہ پر لی ہوئی۔ اُنکا کاروبار فقط رقم شماری کا ایک کھیل تھا۔ اپنی سٹاک میں اُن کی لگائی ہوئی قوم کی قیمت بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ جاتی اور وہ اپنے سٹاک اضافی قیمت پر فروخت کر کے جلدی سے نفع کمالیا کرتے تھے۔ اس طرح اس بات سے اُن کی کوئی غرض نہ تھی کہ جو زمین کرایہ پر لی گئی ہے اس کا کیا بنا۔ عام طور پر ٹھیکوں پر زمین لینے کی مدت تین سال ہوا کرتی تھی۔ اور اکثر اوقات یہ مدت اُس زمین پر کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ہی گزر جایا کرتی تھی۔ وہ لوگ اپنے سٹاک کی قیمتیں بڑھانے کی خاطر اُن زمینوں کے ٹھیکے لیتے تاکہ اپنی کمپنی کے کوائف میں وسعت پیدا کر کے وہ گاہکوں کو اپنی طرف کھینچیں کہ اُن کے پاس امریکہ میں تیل اور گیس کی زمینوں کے ٹھیکے ہیں۔ اس طرح اُن کو اُمید ہوتی کہ وہ اپنے گاہکوں اور دیگر خواہش مند لوگوں سے مزید رقوم حاصل کریں گے اور بالآخر اُن زمینوں پر تیل اور گیس کی کھدائی کا کام شروع کر دیں گے۔

ہمارے لئے یہ ایک اچھا موقع تھا اور ہم نے کافی منافع کمایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں ٹھیک وقت پر ٹھیک جگہ پر تھا۔ اور اُس وقت تک اُس کاروبار کے لئے میرے دل میں کافی جوش پیدا ہو چکا تھا اور اُس میں مزید ترقی کرنے کا شوق تھا۔

ایک سال کے عرصہ کے دوران مجھے خیال آنا شروع ہوا کہ کیوں نہ میں خود تیل اور گیس کے کنوئیں خریدنا شروع کر دوں، کیونکہ فقط زمین ٹھیکوں پر لینے سے کسی لمبی مدت تک متواتر آمدن کی اُمید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اور ماہ بہ ماہ نقد رقم ملنا بھی محال تھا۔ ٹھیکے پر زمین کا لینا ایک اچھا اور تیز رفتار کاروبار تھا مگر تیل کے کنوئیں خریدنا اور نئے کنوئیں کھودنا زیادہ نفع بخش تھا اور اس طرح ایک تواتر کے ساتھ ہر ماہ آمدن بھی مل سکتی تھی۔

اس لئے پوری یکسوئی کے ساتھ میں کنوئیں خریدنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے وچیتا کے شہر جا کر ”کینساس جیالوجی سوسائٹی“ سے کینساس میں تیل کے ذخیروں کے نقشے خریدے اور مالکان زمین یا تیل کی مقامی کمپنیوں سے براہ راست کنوئیں خریدنے شروع کر دیئے۔ جلد ہی مجھے اپنی محنت کا پھل نظر آنا شروع ہو گیا اور میرے جوش و خروش میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔

جیسا کہ ظاہر ہے میں کینساس میں اکیلا آیا تھا اور میرے گھر والے کینیڈا ہی میں تھے، جنکو ملنے میں مہینے میں ایک بار چلا جاتا۔ میں تین ہفتے کینساس میں رہتا اور ایک ہفتہ کینیڈا بُشریٰ اور بچوں کے ساتھ گزارتا۔

بُشریٰ میرے کینساس جانے پر تو رضا مند تھی مگر خود کینیڈا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں ہمارے ہمسائے میں ترمنری نامی ایک خاندان رہتا تھا۔ بُشریٰ نے یہ بندوبست کیا ہوا تھا کہ جب وہ کام پر جاتی تو وہ فیملی ہمارے بچوں کا خیال رکھتی۔ ترمنری فیملی پاکستان سے تھی اور وہ بہت اچھے ملنسار لوگ تھے۔ اُن کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔

جب میں وہاں نہ ہوتا تو اُن کی سب سے بڑی بیٹی جو پندرہ سولہ سال کی تھی ہمارے گھر آکر بُشریٰ کے ساتھ رہتی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ کینساس میں میں اس فکر میں تھا کہ کس طریق سے میں اپنی آمدن میں باقاعدگی اور توازن پیدا کر سکوں۔ یہ ایک دائمی سوال تھا جس کے متعلق میں شروع ہی سے سوچتا رہتا تھا۔ جیسے جیسے میرا کاروبار بڑھتا گیا میں نے وہ زمینیں منتخب کرنا شروع دیں جو کہ ایک لمبے عرصہ تک ذریعہ روزگار ہوں۔ اس کام کے لئے میں نے طبقات الارض کے مقامی ماہرین اور انجینئروں کی مدد حاصل کرنا شروع کر دی جو کہ باقاعدہ طور پر نقشے دیکھ کر مجھے بتا سکتے تھے کہ کہاں کہاں زمین کے نیچے تیل کا ذخیرہ موجود ہونے کا امکان تھا۔ اس طرح مجھے مناسب زمینوں کے انتخاب میں سہولت ہو گئی۔ لیکن پھر بھی ان سب باتوں کے باوجود میرا علم بہت کم تھا کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے کے نیچے کیا مدفون ہے۔ اور ہر ایک ٹھیکہ جو اکھیلنے کے مترادف تھا۔

بعض دفعہ مجھے جی کڑا کر کے اندھیرے میں چھلانگ لگانا پڑتی۔ کئی دفعہ میں زمین کے بہت سارے ٹکڑے کرایہ پر لے لیتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی کی پانچ ہزار ایکڑ زمین ہوتی اور وہ اُس کا کچھ حصہ بیس ڈالرز اور کچھ حصہ چالیس ڈالرز فی ایکڑ دینے کی کوشش کر رہا ہوتا تو میں اُسکی تمام زمین 15 ڈالرز فی ایکڑ کی پیشکش کر کے کرایہ پر لے لیتا۔

پہلے سال میرا کام بہت ہی فائدہ مند رہا اور یہاں آکر میری آمدن ایڈمنٹن کے

مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ یہاں مجھے شراب کے نشہ میں دھت ٹیکسی سوار یوں سے بھی واسطہ نہ پڑتا، اور نہ ہی خون میں لت پت جانوروں کا گوشت کاٹنا پڑتا تھا۔ چنوٹ اور کینساس کے مشرقی حصوں میں آباد زمینداروں کو اپنی زمینوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا اور اُن کی یہ لاعلمی میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو رہی تھی اور میرے علاوہ کوئی دوسرا ان کے دروازے کھٹکھٹا کر مجھ سے زیادہ رقم بھی ان کو پیش نہیں کر رہا تھا۔

اکثر زمیندار بینکوں کے مقروض تھے اور اُن کی زمینیں ویسے ہی بے کار پڑی ہوتی تھیں۔ اس لئے وہ سوچتے کہ کیوں نہ اُن کو کرایہ پر چڑھا کر کچھ رقم حاصل کر لی جائے۔ ادھر جو لوگ اُن زمینوں پر اپنی قوم لگا رہے تھے اُن کو بھی کچھ زیادہ فکر نہ تھی کہ یہاں زیر زمین تیل بھی موجود ہے یا نہیں۔

اکثر زمینداروں کے اثاثے اُنکی اپنی زمینوں کے ساتھ ملحق تھے مگر اُن کے پاس نقد رقم کی ہمیشہ کمی رہتی تھی اور مشکل ہی سے اُن کا گزارہ چلتا تھا۔ تیل کے لئے اپنی زمینیں ٹھیکہ پردینے سے اُنکی آمدن میں اضافہ ہونا شروع ہو جاتا اور وہ اسی اُمید پر اپنی زمینوں کا ٹھیکہ کرتے کہ شاید وہاں سے تیل نکل آئے اور نقد رقم کے وصول ہونے سے اُن کی روزمرہ کی ضروریات پوری ہونا شروع ہو جائیں۔ مزید یہ کہ اگر وہاں سے تیل نکل آتا تو تیل کی فروخت سے ملنے والے منافع میں بھی وہ کم از کم ساڑھے بارہ فیصد کے حصے دار ہونے کی بنا پر اُن کی نقد آمدن میں اچھا خاصہ اضافہ ہو جاتا۔

اُن کی طرز زندگی دیکھنے کا مجھے جتنا زیادہ موقع ملتا، اتنا ہی زیادہ میں پاکستان میں اپنے والد کی زمینوں کے ساتھ مقابلہ کرتا۔ میرے والد کے پاس قیمتی زمینیں تو کافی زیادہ تھیں مگر وہ نقد رقم سے ہمیشہ تہی دست رہتا تھا۔ اس باہمی مقابلہ کے نتیجے میں مجھے مزید محنت کے ساتھ کام کرنے اور تیل اور گیس کے کاروبار کو تقویت دینے کا حوصلہ ملتا رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے مالکانِ زمین سے اپنے تعلقات مضبوط کر لئے اور کینیڈا میں رقوم لگانے والے مختلف افراد کے ساتھ بھی ذاتی روابط بڑھا لئے۔

مالکانِ زمین کے پاس فارغ وقت کی بھتات تھی اور اگر اُن کو کرایہ ادا کرنے میں مجھے کچھ تاخیر ہو جاتی تو وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے مزید مہلت دے دیا کرتے تھے۔ بہت ہی کم ایسا ہوا کہ میرے اور کسی زمیندار کے درمیان کبھی کوئی بد مزگی پیدا ہوئی ہو۔ اگر کسی مفاہمت کے مطابق بات آگے بڑھتی ہوئی نظر نہ آتی تو ہم باہمی رضامندی کے ساتھ اُس سودے کو منسوخ قرار دے دیتے۔ اس رویے کو میں اپنے کاروبار کی حکمتِ عملی کا ایک اہم جز سمجھتا تھا کیونکہ اس طرح لوگوں کا مجھ پر اعتبار بڑھتا جا رہا تھا۔

میرے لئے مالکانِ زمین کے ساتھ اچھے تعلقات برقرار رکھنا بہت ضروری تھا کیونکہ آپس میں اُن سب کی باہمی راہ و رسم کافی مضبوط تھی۔ اس لئے اچھی شہرت انتہائی ضروری تھی۔ میں اُن سے گول مول بات کرنے کی بجائے بالکل بے لاگ طور سے گفتگو

کرتا اور وہ اسے سراہتے ہوئے ایک دوسرے کو کہتے کہ یہ نوجوان بہت منطقی بات کرتا ہے اور جو بھی کہتا ہے عقل اُس کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

میں نے ذاتی طور پر کسی سے قرضہ لئے بغیر کاروبار میں رقم لگانے والے لوگوں کے پیسوں سے کام شروع کیا تھا۔ اس لئے ذاتی طور پر تو مجھ پر کوئی مالی بوجھ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس کاروبار میں میرے مستقبل اور دوسروں کی لگائی گئی رقوم کے تحفظ کا انحصار ایک کافر صفت جنس پر تھا۔ یعنی کھدائی کے بعد زمین سے تیل کا نکالنا۔ اور ہم سب کی مشترکہ خواہش یہی تھی کہ دولت کمائی جائے۔ اور میرا کام یہ تھا کہ مصالحت آمیز گفت و شنید کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کر سکوں۔

میں نے تیل کے ٹھیکے لینے کے کام کو جاری رکھا اور پیٹر و امریکہ نے منافع بنانا شروع کر دیا۔ ہمارے اس کام میں کفایت شعاری ایک بنیادی جُوتھا کیونکہ ایڈمنٹن میں کی گئی کمائی میں سے بہت تھوری سی رقم بطور بچت میرے پاس تھی۔ اس کام کے دوران بعض اوقات مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ جب کوئی شخص ساری بات طے ہونے کے بعد آخر میں عین دستاویز پر دستخط کرنے سے پہلے اپنا ارادہ بدل لیتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی گھرانے کا ایک فرد سودے کی مخالفت کرتا اور باقی تمام افراد خانہ اُس کی طرفداری کرتے ہوئے اُس کی بات مان جاتے اور سودا ہونے سے رہ جاتا۔

بہر حال، میں اپنے کام میں دل و جان سے جمارہا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تیل اور گیس کا کام ایک ترقی پزیر کاروبار ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا یہ کام کر سکتا ہے تو پھر میں بھی

کر سکتا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ٹیکسی چلانے، گھر گھر جا کر برتن بیچنے، یا ایڈمنٹن کے بجلی گھر میں بیٹھے آلات کی اونچ نیچ کو بے دلی سے دیکھتے رہنے سے یہ کام بہر صورت بہتر تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بات سمجھ آنا شروع ہو گئی کہ کاروبار نفع کی مقدار بڑھانے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ مصارف و اخراجات کو قابو میں رکھا جائے۔ جب بھی میں کوئی سودا کر رہا ہوتا ہوں تو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھتا ہوں کہ سب سے زیادہ ضروری بات مصارف پر نظر رکھنا ہے۔ کاروبار کے تعلق سے میری سوچ کفایت شعاری کے محور کے گرد گھومتی ہے کہ مالی زیاں اور غیر ضروری اخراجات سے کیسے بچا جائے۔ اس لئے میں کاروباری اخراجات پر کڑی نظر رکھتا ہوں۔ شاید بعض لوگ اسے فرسودہ خیالی تصور کریں۔ لیکن میرے نزدیک یہ ایک عقلمندانہ عمل ہے۔ میں نے بارہا یہ بات ثابت کی ہے کہ اگر تیل کی قیمت گرتے گرتے آٹھ ڈالر زنی بیرل بھی ہو جائے تو پھر بھی میں مالی نقصان سے بچ نکلوں گا۔ تیل کا کاروبار یا تو دعوتِ عظمیٰ ہے یا قحط پڑنے کے مترادف ہے۔ اور میں نے یہی سیکھا ہے کہ اگر باشعوری سے قحط سالی کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر لی ہو تو پھر قحط کے دنوں میں بھی خوشی خوشی دعوت کھانے کے مزے لئے جاسکتے ہیں۔



اپنے تیل کا پہلا کنواں

جیسے جیسے کاروبار بہتر ہونا شروع ہوا، میں نے چنوٹ میں ایک بڑا مکان کرایہ پر لے لیا۔ وہ وکٹورین سٹائل کا ایک کُشادہ مکان تھا جو کہ 1930ء میں تعمیر ہوا تھا۔ مکان میں داخل ہونے والے بڑے دروازے اور گیراج کے درمیان ایک اور ایک منزلہ عمارت بھی تھی جسکو ”پیٹرو امریکہ“ کا پہلا دفتر بنا لیا گیا۔ جب تیل کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو اُسی دفتر میں سے ”امریکن ڈرلنگ کمپنی“ کا بھی افتتاح کیا گیا۔

دن بدن کاروبار بڑھ رہا تھا اس لئے کام کی زیادتی کی وجہ سے دفتری کام کرنے کے لئے ایک نوجوان خاتون کو بھی ملازم رکھ لیا۔ اُس کا نام یولانڈا تھا اور اسکے ذمہ دفتر میں آنے والوں کا استقبال کرنا اور روزانہ کے آمد و خرچ کے حساب کا اندارج تھا۔ ہمارا دوسرا ملازم اُس کا بھائی برائین تھا اور اُسکے ذمہ تیل کی کھدائی کے کام کی دیکھ بھال تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی ہمارے سب سے پہلے امریکن ملازم تھے۔

ہم نے پیٹرو امریکہ کمپنی کا آغاز کسی لمبے عرصہ کی تحریری منصوبہ بندی کے بغیر ہی شروع کر دیا تھا۔ میری تمام تر توجہ نقد رقم کی متواتر آمدن کو برقرار رکھنے پر مرکوز تھی تاکہ

کاروبار آگے بڑھتا چلا جائے۔ میرا بھائی مہینے میں ایک بار چنوٹ آتا اور کاروبار کو مستحکم اور ترقی پذیر دیکھتا۔

میں نے ہمبولٹ قصبہ کے قریب اپنا سب سے پہلا تیل کا ٹھیکہ لیا جس میں زمین اور کنواں دونوں شامل تھے۔ وہ جگہ کینساس کی ایلن کاؤنٹی میں واقع تھی۔ مجھ سے پہلے وہاں ایک تیل کمپنی کے مالک نے چند کنوؤں کی کھدائی کا کام شروع کیا تھا لیکن اُسے وہاں سے کچھ حاصل نہ ہوا اور اُس کا دیوالیہ نکل گیا اور وہ کنوؤں کی کھدائی کے تمام آلات وہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے مالک زمین سے اپنا تعارف کرانے کے بعد پوچھا کہ کیا میں اُسکی زمین اور کنوئیں کرایہ پر لے سکتا ہوں، تو اُس نے بہ خوشی اپنی رضامندی کا اظہار کیا کیونکہ اُسے پیسے درکار تھے اور اُس زمین میں سے تیل نکلنے کی اُسے کوئی خاص اُمید بھی نہ تھی۔ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کافی لین دین کے بعد اُس کو تھوڑی سی نقد رقم دے کر میں نے اپنی نوعیت کا پہلا سودا کر لیا جس کی مجھے بہت خوشی تھی۔

تیل کی زمین پر میں نے کافی وقت لگایا اور ایک تجربہ کار پمپ چلانے والے کو ملازمت میں لے لیا۔ زمین صاف کروائی اور خستہ حال کنوؤں پر ایک بار پھر سے تیل نکالنے کا کام شروع کروادیا اور میں بے تابی کے ساتھ زندگی میں پہلی بار تیل کی خوشبو سونگھنے کا انتظار کرنے لگا۔

تیل کے کنوؤں پر دوبارہ سے کام شروع کروانے کے بعد میں بہت کان دھر

کے تیل نکلنے کی آوازوں کو سنتا۔ دباؤ ڈال کر تیل نکالنے والے آلات کے زور سے اگر تیل، گیس اور پانی کا آمیزہ پھوٹتا تو ایک اونچی اور لمبی سی ”فروش“ کی آواز نکلتی۔ جسے سُن کر میں بے حد خوش ہوتا۔

اس ٹھیکہ کے نتیجہ میں سب سے پہلے دن مجھے تقریباً پانچ بیرل تیل کا آمیزہ حاصل ہوا جو کہ میرے لئے ایک فائدہ مند دن تھا کیونکہ اُس کے حصول پر میں نے بہت ہی کم رقم لگائی تھی۔ اس طرح جو بھی تیل نکلتا میں اُسے کوش آئل کمپنی کو بیچ دیا کرتا جسکا اُس علاقہ میں تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے تیل کے باقی کنوئیں بھی مرمت کروائے اور اُن سے مزید تیل برآمد ہونے لگا۔ اور اس طرح یہ ایک نفع بخش ٹھیکہ ثابت ہوا جس کو کچھ عرصہ تک میں نے قائم رکھا۔

میں روزانہ جا کر دیکھتا کہ کتنے بیرل تیل نکلا ہے۔ جب سٹاک ٹینک بھر جاتا تو میں اُسے فروخت کر دیتا۔ اُس کے بعد میں نے اور زمینوں کے ٹھیکے تلاش کرنا شروع کر دیئے جن پر تیل کے کنوئیں پہلے سے موجود تھے۔

مجھے اور عزیز کو تیل اور گیس کا کاروبار شروع کئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اور ہم دونوں اس میں برابر کے شریک تھے۔ لیکن اب یہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ہم دونوں کے کاروباری نظریات اور منازل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

عزیز کی زیادہ دلچسپی اس بات میں تھی کہ وہ اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لئے عوام الناس سے رقوم حاصل کر کے نجی کمپنیوں کو عامہ کمپنیاں بنائے مگر میرا نظریہ اس کے

بالکل برعکس تھا۔ میں اپنے کاروبار کو ایک نجی کمپنی کے طور پر چلانا چاہتا تھا اور میں اپنے تجارتی فلسفے کے تحت اپنی خود مختاری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح ایک سال کے بعد ہم دونوں کی تجارتی راہیں جدا جدا ہو گئیں۔

اگر آج کوئی اپنی تجارت شروع کرنا چاہتا ہو تو میری پُر زور رائے یہی ہوگی کہ ابتدا ہی سے اُس کے ذہن میں کاروباری لائحہ عمل اور رقم لگانے کا منصوبہ بالکل واضح ہونا چاہیے۔ اُس وقت اگر میرا کوئی واضح کاروباری لائحہ عمل ہوتا تو میں تیل کے زمینی ٹھیکے لینے کی بجائے شروع ہی سے تیل بار آور کنویں خریدتا۔ بہر حال عام طور پر تو یہی دیکھا گیا ہے کہ تجربات میں سے گزرنے کے بعد ہی انسان کوئی سبق سیکھتا ہے۔

اس دوران میں ماہ بہ ماہ ایڈمنٹن آتا جاتا رہتا تھا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے کی کمی کو محسوس کرتا تھا۔ بُشریٰ کو چنوٹ بالکل پسند نہ تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ ایک چھوٹا سادہ بھاتی قصبہ ہے اور وہاں بچوں کی پرورش کرنا مشکل ہوگا۔ اُسے ایڈمنٹن میں رہنا ہی پسند تھا اور امریکہ نہیں آنا چاہتی تھی۔ 1981 کے موسم گرما میں ایک بار وہ چنوٹ آئی مگر بڑی تکلیف میں اُس نے وہ دن گزارے۔ 1982 میں میں نے چنوٹ چھوڑ کر وچیتا میں اپنا کاروباری دفتر منتقل کر لیا اور وہیں سے میں نے اپنی پہلی نجی کمپنی کا افتتاح کیا جس کا نام 'پائونیر ایکسپلوریشن' (Pioneer Exploration) رکھا۔ اُس کا دفتر ایک چھوٹی سی کرایہ کی جگہ لے کر بنایا گیا تھا جو کہ وچیتا شہر کے قریب ایک شاہراہ عام پر واقع تھا۔

جس وقت میں نے اپنی کمپنی کا نام پائونیر (Pioneer) رکھا تھا، اُس وقت مجھے اِس نام کی اہمیت کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ لیکن اب جو اِس بارے میں سوچتا ہوں تو اغلباً اُس نام کے رکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں خود اپنے گھرانے کا Pioneer (رہنما) تھا جو کہ سب سے پہلے امریکہ آیا۔ 1979 میں کینساس میں رہائش اختیار کی اور امریکہ میں ایک نئی راہ ہموار کی۔

وچیتا میں میرے سب سے پہلے ملازم کا نام ڈان سمٹھ تھا۔ اِس کے ذمہ بہت سارے کام تھے۔ وہ ماہر ارضیات تھا۔ مددگار تھا اور شعبہ امور خارجہ کا تنہا رکن بھی تھا۔ ڈان سات فٹ اونچا اور بھاری بدن والا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ آپ کو دکھائی نہ دے۔ اُس کا قد اور موٹاپا تو بیہشتناک تھے مگر وہ ایک نرم دل دیو تھا۔ اُس نے کینساس یونیورسٹی سے ارضیات کے مضمون میں ڈگری حاصل کی اور تیل کی ایک کمپنی کا ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ مگر اُس کمپنی کا دیوالیہ نکل گیا اور اُس کے بعد اُس نے میرے پاس ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ایک انتہائی ذہین ماہر ارضیات تھا، اور اُس نے کینساس، اوکلاہوما اور دوسری ریاستوں میں کئی تیل کے کنویں خریدنے میں میری بہت مدد کی۔

ہم دونوں نے مل کر چند سال کام کیا اور وہ ہنرمندی سے تجزیہ کرنے والا ثابت ہوا جس نے تیل کی زمینوں کی مخفی قیمت کی پہچان میں میری کافی مدد کی۔ ہم دونوں تیل خریدنے کے کاروبار کی مشہور کمپنیوں، جیسے سن ایکسپلوریشن، شیوران، ایکسان، ٹیکسیکو اور موبیل سے تیل کے کنویں خریدنے کے لئے بولی دینے کے کاغذات تیار کرتے، اُن

کی قیمت کا اندازہ لگاتے اور پھر اُن کمپنیوں کو اپنی بولی پیش کر دیتے۔ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ مجموعی طور پر سودا نفع بخش ہوگا تو ہم بولی کے ساتھ ہی کچھ پیشگی رقم بھی دے دیتے اور کنوؤں کی جائے وقوع پر جا کر اُن کا معائنہ کرتے۔ جب سودا مکمل ہو جاتا تو بقیہ رقم ادا کر دیتے، جس کے لئے میں نے ایک مقامی بینک سے ادھار رقم لینی شروع کر دی تھی۔

1983 میں وچیتا میں ایک ایسا روح پرور واقعہ پیش آیا جس نے میرے ایمان کو بہت تقویت بخشی۔ کینساس میں میں نے ٹیکسیکو کمپنی کے ساتھ تیل کے کئی کنویں خریدنے کا ایک معاہدہ کیا تھا اور اس کی مقررہ تاریخ سے قبل مجھے تین لاکھ ڈالر جمع کروانے تھے۔ میرے پاس اتنی زیادہ رقم نہ تھی اور میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ کہیں سے وہ رقم حاصل کر سکوں۔ میں نے مقامی اخبار میں ایک اشتہار بھی دے رکھا تھا کہ اگر کوئی رقم لگانے والا میرے تیل کے کاروبار میں شامل ہونا چاہے تو وہ میرے ساتھ رابطہ قائم کرے۔ جب مقررہ تاریخ کے آخری چند دن رہ گئے تو میں اُس سودے کی تکمیل سے مایوس ہو گیا، مگر اچانک ایک شخص نے ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ کر کے چند سوالات پوچھے اور بتایا کہ وہ مطلوبہ رقم لگانے کے لئے تیار ہے۔ اگلے دن وہ میرے دفتر آ کر مجھ سے ملا۔ وہ ایک معمر آدمی تھا اور اُس نے کالے رنگ کا بہت عمدہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ مگر تیل اور گیس کے کاروبار کی بابت وہ کچھ زیادہ معلومات نہ رکھتا تھا۔ اُس کے ساتھ ملاقات کے دوران میں نے موجود سودے، مقررہ تاریخ اور اپنے مستقبل کے منصوبوں،

اپنا اور اپنی کمپنی کا اختصاراً تعارف کروایا۔ اور وہ مجھ سے اور میری خود اعتمادی سے کافی متاثر ہوا۔ اُسی دن وہ دوبارہ واپس آیا اور مجھے تین لاکھ ڈالر کا ایک کمیشن چیک لاکر دیا اور اس طرح میں ٹیکسیکو (Texaco) کے ساتھ معاہدہ کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا۔ اور وہ سودا بہت ہی کامیاب اور نفع بخش ثابت ہوا۔

میں نے اُس شریف آدمی سے رابطہ قائم کرنے کی متواتر کوشش کی اور چند مہینوں کے بعد اُس کے حصّہ کے منافع کے چیک بھی اُسے بھیج دیئے۔ مگر وہ تمام چیک کبھی بھی کسی نے نہ تڑوائے! میں نے پوری کوشش کی کسی طرح اُس کا پیسہ لگا سکوں مگر کامیاب نہ ہو سکا! ایسے لگتا تھا کہ گویا اس آدمی کا وجود ہی نہیں ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ عین میری ضرورت کے وقت میری مدد کے لئے ایک فرشتہ تھا جو کہ ایک انسان کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ اور میرا ایمان ہے کہ میری زندگی میں خدا نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ وہی ہے جو مجھے یہاں تک لے آیا ہے اور بہ وقتِ ضرورت وہ مجھے کبھی بھی اکیلا نہ چھوڑے گا۔

مالی فروغ کے سالوں میں میں ہمیشہ صبح سویرے اٹھتا اور سات بجے سے پہلے دفتر پہنچ کر کام شروع کر دیا کرتا اور روزانہ دیر تک کام میں مصروف رہتا۔ میں ہفتے میں چھ روز کام کرتا اور جب دن لمبے ہوتے تو وہ مجھے زیادہ پسند تھے۔ تیل کے میدانوں میں کام کرنے والے مختلف لوگوں سے صبح سویرے میری گفتگو کا آغاز ہوتا اور گزشتہ رات تک سارے ماہ کے دن بہ دن تیل نکالنے کی مقدار کی رپورٹوں کا میں تنقیدی نظر سے جائزہ

لیتا اور اسی طرح اخراجات اور قابل ادائیگی فہرست اشیاء مع قیمت کو بہ غور دیکھتا تا کہ پوری تسلی رہے کہ کوئی ہم سے زیادہ رقم کا مطالبہ تو نہیں کر رہا۔ اس طرح اپنے کاروبار کی تمام تفصیلات کی تہہ تک پہنچنا میرا روزمرہ کا کام تھا۔

وچیتا میں میرے دفتر کے بالکل سامنے ایک ونڈی ریستورینٹ تھا۔ تین سال تک میں نے اکثر اوقات دوپہر اور رات کا کھانا وہیں کھایا۔ سب کو معلوم تھا کہ اگر میں اپنے دفتر میں نہیں ہوں تو ونڈی میں بیٹھا برگر، فرائیز اور فراسٹی کے مزے لے رہا ہوں گا، کیونکہ وہی میرا من بھاتا کھانا تھا۔ میں بہ سرعت امریکن بتا جا رہا تھا۔

ہفتہ اتوار کو میں تیل کی زمینوں پر چلا جاتا اور مختلف مقامات پر تیل کا نکاس کرنے والوں سے ملتا اور اُن سے اخراجات کم رکھنے کے طریقوں پر تبادلہ خیال کرتا۔ مثلاً اگر کسی جگہ بجلی کا استعمال زیادہ ہو رہا ہو تا تو میں فوری طور پر اُن کو بجلی کا استعمال کم کرنے کو کہتا اور اس طرح اخراجات میں کمی لانے سے تیل کی آمدن میں اضافہ ہو جاتا۔

1984-85 میں جب تیل کی قیمت گرنا شروع ہوئی اور آٹھ ڈالر زنی بیرل ہو گئی تو میں نے تیل کھدائی کی زمینوں پر روزانہ جانا شروع کر دیا۔ جہاں کہیں بھی تیل کے کنویں تھے میں وہاں جا کر کام کرنے والوں سے کھل کر بات کرتا۔ میں نے ان کو بتایا کہ چونکہ تیل کی مارکیٹ بڑی تیزی سے گر رہی ہے اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ اُنکو کام سے فارغ کر دوں اسلئے مجھے مجبوراً اُن کی تنخواہوں میں کمی کرنا پڑے گی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تجربہ کار پمپ چلانے والے اور وفادار ملازمین تیل کے کاروبار کا ایک بہت

بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں اور کان ہر وقت پوری قوت کے ساتھ زمین کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور اگر اُن کی مہارت کی قدر کی جائے تو وہ مسائل کا بہت اچھا حل نکال لیتے ہیں اور منافع حاصل کرنے میں مدد ثابت ہوتے ہیں۔ اُن سے براہِ راست بات چیت کرنے اور صاف گوئی سے کام لینے کی وجہ سے اُن کے دلوں میں میری عزت اور اعتماد بڑھ گئے۔

ہم سب نے اجتماعی طور پر اپنے تمام اخراجات پر نظر رکھنا شروع کر دی اور خاموشی سے کام کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ تیل کی قیمت میں دوبارہ اضافہ ہونے لگا اور ہم سب اکٹھے ابھرنا شروع ہو گئے۔ میں تیل کے کاروبار میں دست بہ دست کام کرتا رہا ہوں اور مستقل مزاجی کی بدولت مجھے بہت سی کامیابیاں نصیب ہوئیں ہیں۔ میں زمینوں پر چلا جاتا اور ملازمین سے اپنی معلومات میں اضافہ کر کے ایسے طریقے اختیار کرتا جن کو بروئے کار لانے سے میرے کام کرنے کی اہلیت میں ترقی ہوتی رہی۔ ہم نے اس میدان میں کافی پیسے بنائے اور بے شمار مشکلات کے باوجود ہمارا کاروبار پھلتا پھولتا رہا۔



مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

وچیتا میں میں نے گرد و نواح میں رہنے والے بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی امیر ڈاکٹروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنانا شروع کر دیئے۔ کینساس کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں میری ملاقات ٹام بورٹ سے بھی ہوئی جو مقامی امریکن تھا۔ اُس کی عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ ہوگی اور وہ اپنے علاقہ کا ایک معزز شخص تھا۔ میری واقفیت پہلے اُس کے بیٹے ڈان سے تھی جو کہ ایک خوش شکل نوجوان تھا اور اُسی نے میرا تعارف اپنے باپ سے کرایا تھا۔

مقامی بینک والوں اور دیگر متمول لوگوں کے ساتھ ٹام بورٹ کے اچھے تعلقات تھے۔ ٹام نے میرا تعارف ایک ہندوستانی ڈاکٹر پیٹر ٹیل سے کرایا جو کہ ایک مشہور سرجن تھا۔ ڈاکٹر ٹیل اور چند دوسرے مالدار لوگوں نے تیل کے کنویں خریدنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کے لئے میں تیل کے سودے کروں اور تیل اور گیس کا کاروبار چلاؤں۔ ہمارا باہمی سمجھوتہ یہ ہوا کہ تیل کے کنوؤں کی آمدن میں سے سب سے پہلے ڈاکٹر ٹیل اور دیگر سرمایہ داروں کو اُن کی لگائی ہوئی رقم سو فیصد واپس

لوٹائی جائیں گی۔ کنوؤں کے اثاثہ پر انکی نوے فیصد اور میری دس فیصد ملکیت ہوگی۔ اور اُنکے لگائے ہوئے سرمایہ کی مکمل واپسی کے بعد باقی ماندہ منافع اُن کے اور میرے درمیان ستر اور تیس کی نسبت سے تقسیم ہوا کرے گا اور تیل اور گیس کی کنوؤں کے اور زمین کے تمام انتظامات میرے زیر نگرانی ہوں گے۔

اس باہمی سمجھوتے کے بعد میں نے تیل اور گیس کے کئی کنویں خریدے اور زمینوں کے اجارے حاصل کئے، اور ہم سب کے لئے یہ ایک بہت فائدہ مند سودا ثابت ہوا۔ تمام سرمایہ دار کافی رقم بنا رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ ذاتی طور پر میرے لئے یہ کافی مشقت طلب کام تھا مگر میں کام میں لگن رہا اور کاروبار بہ خوبی چل نکلا۔ لیکن 1980 کی دہائی کے درمیانی سالوں میں تیل کی قیمت ایک دم سے گرنا شروع ہو گئی اور ہمیں خاصا مالی نقصان ہونے لگا۔ جس پر سرمایہ کار حواس باختہ ہونا شروع ہو گئے۔

جس بینک سے انہوں نے قرضے لئے ہوئے تھے۔ اُس نے اس بارہ میں اُن سے استفسار کرنا شروع کر دیا اور وہ سب بینک کے سوالات کے جوابات مہیا کرنے کے لئے میری طرف دیکھنے لگے۔ مگر میرے پاس جواب دینے کو کچھ بھی نہ تھا کیونکہ تیل کی قیمتوں میں غیر متوقع طور پر اچانک کمی آنا شروع ہو گئی تھی اور اس میں میرا کچھ بھی دخل نہ تھا۔ تیل کی مارکیٹ ہر سمت سے خراب ہو رہی تھی اور تیل کی قیمت گرتے گرتے دس ڈالرز فی بیرل سے بھی نیچے آ گئی۔

داکٹر پیل اور اُس کے ساتھی سرمایہ دار سخت پریشان اور غصے میں تھے۔ انہوں

نے اپنے لاکھوں کے نقصان کی ساری ذمہ داری مجھ پر عائد کر دی۔ حالانکہ تیل کی صنعت کے غیر متوقع گردش کھانے میں میرا کچھ بھی دخل نہ تھا لیکن وہ انہوں نے میرے ملازمین کے ساتھ رابطہ قائم کر کے اُن کو میرے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ بد قسمتی سے اپنے اس ردِ عمل میں وہ قدرے کامیاب بھی ہو گئے اور جلد ہی انہوں نے وچیتا کا ایک ٹکڑا وکیل کر کے میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔

یہ بات میرے لئے انتہائی پریشان کن تھی۔ کسی کورٹ میں مقدمہ کے تصور ہی سے مجھے متلی آتی تھی۔ میں نے کئی بار اُن سرمایہ کاروں سے گزارش کی کہ اُس مقدمے کی کارروائی کو ختم کریں، لیکن انہوں نے میری ایک نہ مانی۔

امریکہ میں اس سے قبل میں کبھی بھی کورٹ نہیں گیا تھا اور کسی مقدمے کی پیروی نہ کی تھی۔ میرے لئے یہ معاملہ انتہائی بد دلی کا باعث بن رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس مصیبت کا کوئی حل نکالوں اور اُن کے ساتھ تصفیہ کر سکوں تاکہ مجھے سکون حاصل ہو۔ اس صورتِ حال میں میں نے خود کو سخت مشکل میں گھرا ہوا پایا اور میرے لئے اس کا حل نکالنا لازم ہو گیا۔

ڈاکٹر پیٹیل نے بڑے جارحانہ طور سے مجھے کہا:

”یونس! تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ تمہارے تمام ملازمین میرے طرفدار ہیں۔ اور کورٹ میں تمہیں سزا ملے گی اور تمہیں ہر جانہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔“

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، صحیح ہے یا غلط۔ میں سخت خوفزدہ اور فکر مند ہو گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میرے اختیار میں صرف ایک ہی بات ہے اور وہ یہ کہ تیل اور گیس کے تمام کنوؤں کی پوری ملکیت اپنے ذمہ لے لوں اور اُن کی لگائی ہوئی تمام رقوم پوری کی پوری انہیں واپس کر دوں۔ اُس کے بعد ہم بینک کو مطلع کریں گے کہ ہم بینک سے لیا ہوا قرضہ واپس کرنے کو تیار ہیں جس کے لئے بینک کوئی قابل عمل تجویز پیش کرے۔ بہ الفاظِ دیگر ڈاکٹر ٹیل ہر صورت میں تیل کے کاروبار سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

میں نے اُسے یہ پیشکش کی کہ میں اپنے حصہ کی ساری مالکیت اور آمدن اُن کے حوالے کرنے کو تیار ہوں اور وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ لیکن وہ ایک ڈاکٹر تھا، تیل کا سا ہونا نہ تھا اس لئے وہ کسی بھی ایسے معاملہ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا جو کہ خسارے میں جا رہا ہو۔ خصوصاً جس کاروبار کے متعلق اُسے کچھ بھی علم نہ ہو۔ اس دوران ٹام بورٹے بھی پریشان ہونا شروع ہو گیا۔ وہ مقامی بینک کا ایک ڈائریکٹر بھی تھا اور جانتا تھا کہ نہ وہ اور نہ کوئی دوسرا سرمایہ دار تیل کے کاروبار کو چلا سکے گا۔ لیکن مالی معاملات کو سلجھانے کی اہلیت اُس میں تھی جو کہ مجھ میں مفقود تھی۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ میں بینک سے قرضہ حاصل کروں اور ہر ایک سرمایہ دار کے تمام حصص خرید کر خود اپنے نام کر لوں۔

میرے حصہ داروں نے قرضے مقامی بینک سے لئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اُنکے قرضے بے سود اپنے نام کر کے موجودہ اور گزشتہ تمام بقایا جات کی

ماہ بہ ماہ ادائیگی کروں گا۔ بینک کو میں نے ذاتی طور پر تحریری ضمانت بھی دے دی کہ اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

بینک بھی بہر صورت دِوالا ہونے سے بچنا چاہتا تھا اس لئے اُس نے تمام حصہ داروں کو سمجھایا کہ وہ اپنے قرضے میرے نام کر دیں۔ تمام سرمایہ دار اس تجویز پر رضا مند ہو گئے اور قرضوں کی ادائیگی میری ذمہ پڑ گئی۔ لیکن بینک نے احتیاطاً اُن کو مکمل طور سے فارغ نہیں کیا کہ اگر کسی وجہ سے میں اپنی کاوش میں ناکام رہ جاؤں تو قرضوں کی ادائیگی دوبارہ اُن کی ذمہ داری ہوگی۔

بہر حال مقدمہ خارج کر دیا گیا اور ڈاکٹر ٹیل مطمئن ہو گیا۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر ٹیل ایک اچھا با اخلاق انسان تھا لیکن اُن دنوں خوف کے تحت اُسکو ناگوار فیصلے کرنے پڑے۔ میری بہترین تمنائیں اور دعائیں ڈاکٹر ٹیل اور باقی تمام سرمایہ لگانے والوں کے ساتھ ہیں۔

اب مجھے اپنے سر سے ایک بھاری بوجھ اتارنا تھا، یعنی بینک کو ساری رقم واپس کرنی تھی۔ اس کاروبار میں عام طور پر لوگ جسے تیل اور گیس کا رولر کوسٹر (Roller Coaster) کہتے ہیں، میں اُس میں پہلی بار سواری لے رہا تھا۔ جو لوگ اس کاروبار میں ہیں، وہ اس سواری سے اچھے خاصے واقف ہیں۔ ایک فلم بنام میں Parenthood ہے کہ ایک اسی سالہ بوڑھی خاتون اس موضوع پر بات کرتی ہے کہ آیا زندگی میں میری گوراؤنڈ (Merry-Go-Round) کی سواری بہتر ہے یا ایک رولر کوسٹر کی؟ اور وہ

خاتون رولر کو سٹری سواری کو ترجیح دیتی ہے، کیونکہ بقول اُس کے:
 ”مجھے یہ انتہائی اچھا لگتا ہے کہ کوئی سواری بیک وقت اس قدر خوفناک،
 ہیجان انگیز اور سنسنی خیز ہو۔“

اُس نے کہا کہ میری گوراؤنڈ تو بس ایک گول دائرے میں گھومتی چلی جاتی ہے اور
 اُس سے جذبات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ میرے دوستو، یہ ہے تیل اور گیس کے
 کاروبار کا خلاصہ۔

الغرض میں نے دوبارہ تفصیلی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ قیمتیں متواتر گرتی جا
 رہی تھیں اور مجھے پہلے سے بہت زیادہ ہوشمندی، مستعدی اور محنت کے ساتھ کام کرنا
 پڑ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے چند مہینوں کے بعد تیل کی قیمتیں بڑھنا شروع ہو گئیں اور بینک
 کے ساتھ بغیر کسی تنازعہ مسئلہ کے تمام قرضہ بمع سود اتارنے کی مجھے توفیق مل گئی۔ اس
 طرح ایک بہت بڑا بحران ختم ہوا۔

اس واقعہ سے میں نے اپنی بیوپاری زندگی کے دو سبق سیکھے۔ ایک تو یہ کہ مشکل
 حالات کا کس طرح احسن رنگ میں مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا سبق جو کہ سب سے
 زیادہ ضروری ہے کہ جلد بازی کی سوچ سے عرصہ دراز میں حاصل ہونے والے نتائج
 حاصل نہیں ہوتے۔ میرے کاروبار میں رقم لگانے والے سرمایہ دار جلدی سے نفع کمانا
 چاہتے تھے اور انکی کاروباری سوچ محدود تھی۔ اس لئے جب قیمتیں گرنا شروع ہوئیں تو
 وہ بوکھلا گئے اور مجھے ملامت کرنا شروع کر دیا، اور بھول گئے کہ بیرونی وجوہات کی بنا پر

کہ جو کسی کے قابو میں نہ تھیں تیل کی مارکیٹ خراب ہو رہی تھی۔

یہ واقعہ میری زندگی کا ایک بڑا موڑ ثابت ہوا۔ میں ایسے حالات میں گھر گیا تھا جس نے میری بنیادیں ہلا کر رکھ دیں، لیکن پھر بھی میں اُنکا حل نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح مجھے ایک عظیم کامرانی عطا ہوئی۔

جلد ہی اُن کے تمام کنویں اور سامان میری پوری ملکیت میں تھے اور جیسے جیسے تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہونا شروع ہوا میں نے اچھی خاصی رقم بنالی اور تمام قرضے ادا کر دیئے۔ بینک مجھ سے اتنا خوش تھا کہ مجھے مزید قرضہ دینے پر تیار ہو گیا۔ میں نے بینک کا اعتماد جیت لیا تھا کہ مجھ میں اپنا کاروبار چلانے کی فراست موجود ہے اور میں ہمت کے ساتھ پیچیدہ اور کافور صفت تیل کے کاروبار میں پیدا ہونے والی مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور صبر و تحمل اور حاضر دماغی کے ساتھ جو کام بھی اپنے ذمہ لوں، اُسے پورا کر سکتا ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ اب میں پورے اعتماد کے ساتھ خود کو ’آئل مین‘ (Oilman) کہہ سکتا ہوں۔ پہلے جو حالات میرے دماغ کو چکرا دیا کرتے تھے اب اچانک انہی کی بدولت مجھے جرأت مندانہ سودے کرنے کی قوت مل گئی۔ میں نے جان لیا کہ مستقل مزاجی، تحمل اور مصلحت آمیز خطرہ مول لینے سے میں اپنے کاروبار میں مزید ترقی کر سکتا ہوں۔

کینساس میں جس وقت سرمایہ کاروں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا تھا تو اُس

وقت منافع میں میرا حصہ صرف دس فیصد تھا اور سارا کام بھی مجھے کرنا پڑتا تھا، اور انکا حصہ 90 فیصد تھا۔ مگر اب چند مہینوں کے بعد میری ملکیت 100 فیصد تھی۔ بینک کا تمام قرضہ اُتر چکا تھا اور میں نے کبھی بھی مُر کر ماضی کے حالات کو پشیمانی کی نظر سے نہ دیکھا۔ اُس سودے کے نتیجے میں میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ملین ڈالر کمائے۔ مگر تیل اور گیس کے کاروبار کا پہلی بار مزہ چکھنے کے بعد میرا ارادہ اُس سے بھی زیادہ منافع کمانے کا تھا۔

1982 میں عزیز اور میں ایک تیل کے تاجر سے ملنے بلیک ویل، اوکلا ہوما گئے جو کہ ایک مقامی گرجے کا واعظ بھی تھا۔ اُس کے مہمان خانے میں بیٹھے جب ہم اُس سے گفتگو کر رہے تھے تو میں نے اُس کے سامنے میز پر ایک بڑا لفافہ دیکھا جو کہ اسے 'سُن پروڈکشن اینڈ ایکسپلوریشن' (Sun Production and Exploration) کمپنی کی طرف سے آیا تھا۔ گفتگو کے دوران اُس نے لا پرواہی سے اُس لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ ڈلس سے ایک کمپنی اُسے یہ لفافہ بھیجتی رہتی ہے مگر اُس نے کبھی بھی اُن کو نہیں کھولا۔ میں نے وہ لفافہ اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی تو اُس نے خوشی سے وہ مجھ دے دیا۔ بہ وقتِ رخصت ہم نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور وہ لفافہ اپنے ساتھ لے آئے۔

جب ہم اپنی کار میں آکر بیٹھ گئے تو میں نے بڑے تجسس کے ساتھ اُس لفافے کو کھولا اور دیکھا کہ اُس کمپنی کی طرف سے تیل اور گیس کی کئی املاک فروخت پر لگی ہوئی

ہیں اور مختلف علاقوں میں اُن املاک کے متعلق تفصیلی معلومات بھی درج ہیں۔

اس طرح غیر متوقع طور پر اُن معلومات کے مل جانے پر ہم بہت خوش تھے اور ہم میں ایک ہيجانی کیفیت پیدا ہو گئی اور اگلے ہی دن میں نے سَن ایک پلوریشن میں اپنا نام درج کرا کر بولیاں دینا شروع کر دیں اور مجھے یقین ہے کہ عزیز نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ مقابلۂ اونچی بولیاں دینے کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے تیل کے کاروبار میرے لئے کافی نفع بخش ثابت ہوئے۔

1980 کے اوائل میں میں نے وینکوور، کیلگری اور دوسرے شہروں میں سفر کرنا شروع کر دیا تاکہ میں مزید سرمایہ داروں کو تلاش کروں جو کہ مجھ سے تیل اور گیس کے اجارے خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میری دوستی ایک آرٹھتی سے ہو گئی جو اجارہ داری کی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ اُس نے میرا تعارف بہت سے ایسے لوگوں سے کرایا جن کے مختلف کمپنیوں میں سٹاک تھے اور وہ اپنے سٹاک مجھ پر بیچ کر تیل اور گیس کی زمینیں لینے پر تیار تھے۔ میں نے اُن سودوں سے اچھے خاصے پیسے بنائے، کیونکہ سٹاک کی خرید و فروخت کے کاروبار میں تھوڑے سے ہی عرصہ میں سُرعت کے ساتھ مجھے اچھی قیمتیں ملنا شروع ہو گئیں اور اس طرح مجھے نقد رقم ملنے لگی جس سے میرے تیل اور گیس کے کاروبار کو کافی تقویت پہنچی۔

یہاں ٹیکساس میں میں سرمایہ داروں کو تیل کے اجارے فروخت کر رہا تھا جو اپنے سٹاک میرے نام کر کے پُر امید تھے کہ ایک دن وہ ٹھیکے پر لی ہوئی زمینوں میں سے

کنویں نکال کر خوب مال بنائیں گے۔ وہ تمام سودے میرے لئے نفع بخش تو تھے لیکن میں زیادہ دیر تک انہیں جاری نہ رکھ سکا کیونکہ اُن کے واسطے مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا اور میں اپنے کاروبار میں کافی حد تک مستحکم ہو چکا تھا۔ جب کبھی میں اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے یہی سمجھ آتا ہے کہ جب کبھی میں نے کسی مناسب وقت قسمت آزمائی کی تو اُس تجربہ نے خطرہ مول لینے کی قدر سمجھنے میں میری بہت مدد کی اور میرے قدم مزید ترقی اور کامیابی کی جانب بڑھا دیئے۔

اپنی تمام معاشی زندگی کے دوران میں نے اپنی کمپنیوں کو عامہ (Public) بنانے میں کبھی بھی دلچسپی نہ لی، حالانکہ کئی بار ایسے کاروباری مواقع میرے سامنے آئے۔ مجھے اپنی خود مختاری اور بطور نگران اپنی ذمہ داری سے دست بردار ہونا پسند نہ تھا۔

جب کبھی میرا کوئی سودا نہ بنتا، یا مجھے کسی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تو میں نے خود کو پریشانی سے بچانے کے لئے ایک طریقہ سوچا ہوا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے رُک کر غور کرتا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ غم میں گھلنے کی بجائے میں اپنی کمزوریوں پر نظر دوڑاتا اور سوچتا کہ انہیں کس طرح دُور کیا جاسکتا ہے۔ اُس کے بعد سارے واقعہ کو دل سے نکال دیتا۔ اس طرز فکر پر کچھ وقت تو صرف ہو جاتا، لیکن میری یہی کوشش ہوتی کہ ماضی کی بجائے مستقبل کو سامنے رکھوں۔ ہم ماضی کو بدل نہیں سکتے اور مستقبل کا کچھ علم نہیں، اس لئے بہتر ہے کہ ہم حال ہی میں رہیں۔

میں نے 1983ء میں پائینیر (Pioneer) کمپنی کا اجراء کیا تھا۔ جس نے میرے

تمام گھرانے والوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں اور بہت سے لوگوں کو روزگار مہیا کیا۔ کسی موقع کے اتفاقاً پیش آنے کا انتظار کرنے کے بجائے، اس یقین کے ساتھ کہ خداوند تعالیٰ مناسب مواقع مہیا کرتا ہے میں عملی اقدام اٹھانے کا قائل ہوں۔ ضروری ہے کہ ہم اُن سے فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ اگر ہم اُن سے بروقت فائدہ نہ اٹھائیں گے تو قدرتی بات ہے وہ ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس لئے جب کبھی کوئی اچھا موقع دروازے پر دستک دے تو اُسے ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، کیونکہ درحقیقت وہ ایک انعام خداوندی ہی ہوتا ہے۔

میرے ذہن میں جب بھی کوئی قابل عمل خیال آتا تو یہ سوچتے ہوئے میں آگے بڑھنا شروع کر دیتا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ میرے بھائی نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھ کر جب فون کیا تھا تو میں 1979 کے موسم گرما میں اُس رُخ چل پڑا۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف میری زندگی بدل گئی، بلکہ میرے تمام گھر والوں اور دیگر بہت سے لوگوں کی زندگیاں بھی مثبت طور پر متاثر ہوئیں۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہاں میں اسے کروں گا۔

جب آپ کی زندگی کا آغاز نصف دُنیا دُور ایک چھوٹے سے دیہات میں خالی ہاتھوں ہوا ہو تو پھر یہ ضروری نہیں کہ آپ کسی لالچ کی خاطر دوڑ لگائیں۔ بلکہ آپ اپنے اور اپنے گھر والوں کا ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے جذبہ کے تحت اپنے سفر کا آغاز کریں۔

کاروبار میں نہ تو میرا کوئی تجربہ کار اتالیق تھا اور نہ ہی میں کسی تجارتی نیٹ ورک میں عملی طور پر شامل رہا ہوں۔ اور اپنی مدد آپ کے موضوع پر لکھی ہوئی کوئی کتاب بھی مطالعہ نہیں کی۔ ہاں البتہ زنگ زنگ کو کبھی بکھار سن لیا کرتا تھا جو کہ ایک جوشیلا سا ہو کار تھا۔ لیکن کبھی بھی میں نے سنجیدگی سے اُس کی باتوں پر عمل نہیں کیا۔ خود اپنے آپ کو محرک رکھنا میرا اصل اثاثہ ہے جو کہ لین دین کے تقریباً تمام معاملات میں میرے بہت کام آتا رہا ہے۔

گذشتہ دنوں میری نو اسی نے مجھ سے پوچھا:

”پاپا، آپ کے پاس وہ تمام چیزیں موجود ہیں جنکی آپ کو خواہش تھی، تو

اب آپ ریٹائر کیوں نہیں ہو جاتے؟“

میں نے اُسے بتایا کہ بے شک میری عمر بڑھ رہی ہے مگر میرے جذبہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ جب تک انسانی دماغ مصروف رہے اور کسی کام میں لگا رہے، اُس وقت تک وہ صحت مند رہتا ہے۔ اور خاص طور پر جب عمر زیادہ ہو رہی ہو تو اُس وقت اُسے مصروف رکھنا، اور ایک لگن کے ساتھ اپنا پسندیدہ کام کرتے چلے جانا بہت ضروری ہے۔ میں باسانی باقی ماندہ زندگی اور اپنا سارا وقت گولف کھیلنے یا کسی دوسرے کام میں گزار سکتا ہوں، لیکن مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی بجائے میں چاہتا ہوں کہ پوری تندہی کے ساتھ یونس اینڈ بشری فاؤنڈیشن اور اپنے کاروبار میں مصروف رہوں۔ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ عمر چاہے جتنی بھی زیادہ ہو جائے، اپنی

رہنمائی آپ، دماغی محنت، آسودہ خاطری، اطمینانِ قلب اور عملِ پیہم، یہ سب باتیں بے حد ضروری ہیں۔

اگر آپ مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنا پسند کرتے ہیں تو پھر تیل اور گیس کے کاروبار سے بہتر کوئی دوسرا کام نہیں جو کہ انتہائی تیز رفتار اور ہیجان خیز کاروبار ہے۔ یہ اچھی خاصی پریشانی کا موجب بھی بن سکتا ہے (جیسا کہ اس سے قبل رولر کوسٹر کی مثال سے بتایا جا چکا ہے)، لیکن مجموعی طور پر بہت فائدہ مند ہے۔ جتنے زیادہ خطرات مول لئے جائیں گے اتنے ہی زیادہ فائدے اور اُسی قدر بڑے نقصانات بھی پہنچ سکتے ہیں۔ بہر حال تجربہ، ناکامی اور فطری احساس آپ کو تجارت میں قدم آگے بڑھانے کے طریق سمجھنے میں رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

میں نے زندگی میں کبھی بھی اپنے دو الائنکل جانے کی کسی عدالت میں درخواست نہیں دی اور انتہائی عاجزی سے اس بات پر فخر ہے کہ جب تیل کی قیمتیں گر گئیں تو بہت سی تیل اور گیس کی کمپنیوں کو اپنے دروازے بند کرنا پڑے۔ مجھے شروع ہی سے تیل کی قیمتوں میں اونچ نیچ کے خطرات کا اندیشہ تھا، اس لئے میں نے زمینوں اور عمارات کی خریداری میں سرمایہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ اور اس طرح تیل و گیس کے کافور صفت کاروبار میں نقصان کی تلافی کا انتظام کر لیا اور مجھے دُور رس مالی محافظت بھی حاصل ہو گئی۔

اس کے علاوہ مجھے اپنے صبر و استقلال کی صلاحیت کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ گذشتہ

چند ہائیوں میں میں نے تیل اور گیس کے کافی زیادہ کنویں خرید لئے تاکہ آمدن جاری رہے۔ میں نے مختلف ریاستوں میں تیل اور گیس کی خریدی ہوئی زمینوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھا اور اپنی ملکیت کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا۔

1980 کے سالوں میں کینساس میں ہونے والے تلخ تجربہ کے بعد مجھے پسند نہ تھا کہ امیر سرمایہ داروں اور سرمایہ لگانے والی کمپنیوں کا اپنا حصہ دار بناؤں۔ اس دوران مجھے کئی بار ایکویٹی (equity) کمپنیوں کی طرف سے میرے کاروبار کے حصے خریدنے کی پیشکش ہوئی، جس کو میں نے کبھی قبول نہ کیا، کیونکہ اس میں سب سے بڑا حرج یہ تھا کہ کاروبار میں میری خود مختاری چلی جاتی اور مجھے دوسروں کے لئے کام کرنا پڑتا اور چونکہ سرمایہ لگانے والوں کو پوری صورت حال کا علم بھی نہیں ہوتا کہ ایسے سودوں میں ناکامی کے مواقع بھی کافی زیادہ ہیں۔ اس لئے میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے کاروبار کی ذاتی ملکیت کو پوری طرح برقرار رکھوں گا اور میں اس فیصلہ پر مکمل استحکام کے ساتھ کاروبار بند ہوں اور اپنی خود مختاری کو برقرار رکھا ہوا ہے۔

اپنی کاروباری زندگی کے دوران مجھے یہ بات سمجھ آئی کہ کسی غلطی کے ہو جانے سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور آگے بڑھتے چلے جانا چاہیے۔ اور یہ بات کسی کتاب پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ (حالانکہ مجھے خوشی ہے کہ آپ میری یہ کتاب پڑھ رہے ہیں)۔ اس بات کے سیکھنے میں آپ کو اپنا ذاتی تجربہ درکار ہے۔ کوئی دوسرا آپ کو نہیں بتا سکتا کہ خطرہ کس طرح مول لینا چاہیے اور کون سے خطرات میں قدم رکھنا چاہیے۔ غلطی

کرنا، بجائے خود ایک فائدہ مند بات ہے اور آپ حقیقی طور پر پوری طرح سے نہیں اُبھر سکتے جب تک کہ آپ گرتے ہوئے سب سے چلی تہہ سے نہ ٹکرا جائیں۔

کاروبار کی دُنیا میں میں نے زیادہ تر سود مند فیصلے اُس وقت کئے جب کہ میں دباؤ کے نیچے تھا، اور مجھے پریشانیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ مجھے بڑی بڑی کامیابیاں سخت نا کامیوں کے بعد حاصل ہوئیں۔

کام کرنے کے مضبوط اور مستقل اصولوں نے مجھے ترقی کی زینوں پر چڑھایا۔ اگر میرے ملازمین روزانہ دس گھنٹے کام کرتے تو میں گیارہ گھنٹے کام کیا کرتا تھا تا کہ ان کے لئے خود ایک مثال بن کر اُن کی رہنمائی کر سکوں۔ ملازمین کے ساتھ سلوک میں میں بہت محتاط لیکن فوری قدم اُٹھاتا تھا۔

کسی کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اگر میرے پاس آپ کو کچھ پیشکش کرنے کے واسطے ہے تو وہ مندرجہ ذیل سادہ مگر ضروری اصول ہیں جو کہ میرے لئے مفید ثابت ہوئے، اور میں پورے خلوصِ دل سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے لئے بھی فائدہ مند ہوں گے:

1- اپنی تمنائیں بلند رکھیں، سخت جانی سے محنت کریں اور مستقل مزاجی کو

اپنائیں۔

2- کام میں مگن رہیں اور مَرُ کر ماضی کی جانب نہ دیکھیں۔

3- اپنے بنیادی کاموں اور فروعی کاموں کو متنوع رکھیں۔

- 4۔ ملکی قوانین کے پابند رہیں۔
- 5۔ اپنے قرض خواہوں سے اچھے تعلقات رکھیں۔
- 6۔ خود اعتمادی اور بے خوفی سے کام کریں۔
- 7۔ اپنے اخراجات پر گہری نظر رکھیں اور مالی مشکلات کا حل نکالیں۔
- 8۔ استعداد اور اہلیت کو مرکوز رکھتے ہوئے خود اپنے کام میں مصروف رہیں اور تیز رفتاری دکھائیں۔
- 9۔ خود اپنی مثال قائم کریں اور دوسروں کے لئے قابل تقلید نمونہ بنیں اور خود نمائی کے بغیر دوسروں کا ہاتھ بٹائیں۔
- 10۔ اپنی زندگی اور کاروبار میں سوچتے سمجھتے ہوئے مصلحت آمیز مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالیں۔
- 11۔ ہمیشہ جذبہ سے معمور رہیں۔



احمدی ہونے کی وجہ سے میرے والد قید خانہ میں

مجھے امریکہ میں جس وقت تمام سہولتیں میسر آنا شروع ہو چکی تھیں، اُس وقت آدھی دُنیا دُور میرے والد کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تمام خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔

1984 کے موسم خزاں کی ایک خاصی ٹھنڈی رات تھی اور میرے والد فرید ٹاؤن، ساہیوال میں اپنے گھر میں آرام سے سوئے ہوئے تھے کہ صبح دو بجے کے قریب اُنہیں دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی موٹر گاڑی کے چلنے کا شور سنائی دیا جو کہ اغلباً پولیس کی جیپ گاڑی تھی۔ پھر اُنہیں بوٹوں کی ٹاپ بھی سنائی دی۔ اُنہوں نے اُن آوازوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی اور سوچا کہ پولیس والے گاؤں کی حفاظت کے لئے گشت کر رہے ہیں کیونکہ اُن دنوں ملک میں مارشل لا نافذ تھا۔

لیکن دروازے پر دستک کی آواز زیادہ اونچی ہوتی گئی اور جیپ کی بتیوں کی تیز روشنی سامنے کی کھڑکی سے گھر کے اندر آنے لگی اور بوٹوں کی ٹاپ کی آوازیں بھی سارے گھر کے ارد گرد سے آنا شروع ہو گئیں۔ میرے والد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ

معاملہ کیا ہے! وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کمرے کے دروازے تک آئے تو عین سامنے انہیں پولیس کا ایک سپاہی کھڑا نظر آیا۔ اُس سپاہی نے اُن کو دیکھتے ہی کہا:

”تم زیر حراست ہو!“

میرے والد ابھی تک نیم خوابی کے عالم میں تھے، انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کس لئے؟ سپاہی نے جواب دیا کہ ساہیوال مسجد میں قتل کرنے کے جرم میں۔

”کونسا قتل؟ کس جگہ؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو!“

میرے والد نے کہا۔

سپاہی نے کچھ دیر رکنے کے بعد آہستہ آہستہ انہیں انتہائی ہیبت ناک خبر سنادی۔ میرے والد پر یہ الزام تھا کہ وہ اُن گیارہ احمدیوں میں شامل ہے جنہوں نے ساہیوال احمدیہ مسجد میں دو احتجاجیوں کو قتل کیا تھا۔ پہلے تو میرے والد کو شک ہوا کہ شاید پولیس یہ سنگین الزام اس لئے تراش رہی ہے کہ وہ اُس سے کچھ رقم وصول کرے، کیونکہ پولیس کو معلوم تھا کہ اُس کے بیٹے ملک سے باہر ہیں اور انہیں پیسے بھیجتے رہتے ہیں۔

اس لئے انہوں نے سپاہی سے پوچھا کہ حراست سے بچنے کے لئے اُسے کتنی رقم ادا کرنی پڑے گی؟ کیونکہ عمومی طور پر پاکستانی پولیس کا یہ طریقہ تھا کہ حراست نامہ چاک کر کے وہ گھر پہنچ جایا کرتی تھی اور رقم وصول کرنے کے بعد واپس پولیس سٹیشن جا کر اطلاع دیتی کہ اُن کو ملزم ہاتھ نہیں آیا۔ مگر اُس سپاہی کا چہرہ کافی سنجیدہ تھا۔ اُس نے کہا:

”جناب! میں آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتا۔ میرے اعلیٰ افسران باہر

کھڑے ہیں اور صدرِ پاکستان ضیاء الحق کی بلا واسطہ اس کیس پر نظر ہے۔“

یہ شورُن کر میری 104 سالہ بوڑھی دادی اماں بھی جاگ گئیں جو کہ ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے انہیں تو کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن میری امی اور چھوٹی بہن انتہائی سخت بے چین ہو گئیں اور جس وقت پولیس والا میرے والد کو قتل کے جرم کی سنگینی اور متوقع سزائے موت کی اطلاع دے رہا تھا تو اُن دونوں نے بے قابو ہو کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ آپ خود تصور کریں کہ آدھی رات کے وقت اگر پولیس آپ کے گھر کے ایک بے قصور انسان کو پکڑ کر جیل لے جائے اور باقی افراد خانہ کو پیچھے تنہا اور خوفزدہ چھوڑ دے تو اُن پر کیا گزرے گی! اس قسم کی وارداتیں تو بہ کثرت ہوا کرتی تھیں لیکن ہمیں کبھی خیال بھی نہ آیا تھا یہ واقعہ خود ہمارے اپنے گھر والوں کو بھی درپیش آجائے گا۔

میرے والد کے پاس پولیس والوں کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اُن کو وہاں سے اُٹھا کر ساہیوال سینٹرل جیل لے گئے جو کہ پاکستان کا ایک بہت پُرانا اور بدنام قید خانہ تھا۔ اُس جیل کے حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے اور وہاں انتہائی سنگین مجرموں کو رکھا جاتا تھا اور اب میرے والد کو بھی اُنہی میں شمار کیا جا رہا تھا۔ میرے والد کو قید و بند کی سزا صرف اس لئے دی جا رہی تھی کہ وہ ایک احمدی مسلمان تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے!

گل گیارہ احمد یوں پر قتل کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ مگر حکومتی کارندوں کو صرف سات آدمی ہاتھ آئے۔ میرے والد اور باقی چھ افراد جیل خانے میں سب سے سخت پہرے کے اندر کلاس C میں رکھے گئے تھے جو کہ سب سے نچلے درجہ کی قید ہوتی ہے۔ اُس جیل خانے میں گنجائش سے زیادہ قیدی ڈالے جاتے تھے۔ اُس کی دیواریں پان کی پکیوں سے سُرخ تھیں۔ اُس کا فرش جامد، ننگا اور انتہائی غلیظ اور پیشاب، پسینہ اور خون کے داغوں سے بھرپور تھا۔ وہاں کئی ہولناک واقعات ہو گزرے تھے۔ مکھیاں، مچھر اور کیڑے مکوڑے بھی باہم متقابل رہتے کہ اُن کو انسانوں کے ساتھ رہنے کی وہاں جگہ مل جائے۔

میرے والد اور باقی چھ افراد زیادہ وقت دعاؤں میں گزارتے اور جب بھی ممکن ہوتا تھوڑی بہت نیند پوری کر لیتے۔ وہ سب خوف کی حالت میں دن گزار رہے تھے کیونکہ اُن کو یہ بتایا گیا تھا کہ کسی وقت بھی اُن کو پھانسی دے کر مارا جاسکتا ہے۔ میرے والد انتہائی غمزہ دگی میں سوچتے کہ وہ وہاں کس لئے ہیں؟ اُس سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے؟ اُنہیں کس لئے قید کیا گیا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ میرے والد اکثر یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ ایک دن اُن کو پھانسی لگا دی جائے گی۔ وہ اپنے ایمان میں مضبوط تھے اور اُنہوں نے رور و کر بہت دعائیں مانگی کہ خدا اُن کی زندگی بچا دے۔ اُن کے خلاف جو مقدمہ تھا وہ مبینہ طور پر ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا کیوں کہ اُن پر جو قتل کا الزام لگایا گیا تھا، مکمل طور پر وہ اُس سے مُبرّا تھے۔

حکومت کے بیان کے مطابق 26 اکتوبر 1984 کی صبح فجر کی نماز سے کچھ دیر پہلے ایک مدرسہ کے طالبان نے ساہیوال میں احمدیہ مسجد پر حملہ کیا اور طالبان کا وہ جم غفیر تشدد پر اتر آیا۔ انہوں نے مسجد کے اندر لکھی ہوئی قرآنی آیات کو مٹانے کے لئے اُن پر نیلا رنگ پھینکنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب طالبان نے مسجد کے مقدس حصوں کی بے حرمتی شروع کر دی تو مسجد کے محافظ نے ہجوم پر گولی چلا کر اُن میں سے ایک کو مار دیا جس کا نام قاری بشیر احمد تھا۔ اُس محافظ نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کلمہ طیبہ کو بچانے کی کوشش کی تھی جو کہ تمام مسلمانوں کے ایمان کا ایک انتہائی مقدس جزو ہے اور کلمہ طیبہ کا یہ تقدس آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔

حکومت کے کارندوں نے میرے والد کو جیل میں ڈال دیا حالانکہ اُس پیش آنے والے واقعہ کے ساتھ اُن کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ اُن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ایک احمدی مسلمان ہیں اور ایک اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہیں جس کو سنی مسلمانوں کا اکثریتی فرقہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

وچیتا میں میری بھابھی نے فون کر کے مجھے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا، اور پاکستان جانے والے سب سے پہلے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر میں وہاں پہنچ گیا، کیونکہ میں اپنے والد کے قریب آنا چاہتا تھا۔ جب جیل میں جا کر میں نے اپنے والد کو دیکھا تو اُن کی ناقابل یقین حالت پر نظر پڑتے ہی میرا دل ڈوب گیا۔ جیل کے محافظ مجھ سے ملانے کے لئے انہیں لائے تو وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں، پاؤں اور

کمر میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ تمام جسم پر اتنی زیادہ زنجیروں کی وجہ سے کھڑا ہونا، چلنا اور بیٹھنا سب اُن کے لئے مشکل تھا اور میرے لئے یہ ایک ہیبت ناک نظارہ تھا۔ میرے والد کی مظلومانہ حالت، غمناک سنجیدہ چہرہ، ہوش باختہ آنکھیں اور جو سلوک اُن سے کیا جا رہا تھا، میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اُنہوں نے قیدیوں کا لباس پہنا ہوا تھا اور جیل خانہ والے اُن کے ساتھ ایک سنگین مجرم ہونے کی طرح کا سلوک کر رہے تھے۔ وہ پراگندہ حال تھے۔ اُن کے چہرے کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اُنہوں نے کچھ زیادہ باتیں بھی نہیں کیں۔

اپنے والد کو اس حالت میں دیکھنا میرے لئے بے حد مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تو خاندان کے سب سے زیادہ بااثر، محنت کش اور نیک دل انسان تھے، مگر اُن کو انتہائی ذلیل کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا اور میں کئی دنوں، بلکہ ہفتوں تک کس مپرسی کی حالت میں روتا رہا۔

یقین بڑا رہبر ہے۔ اسلئے میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اُن پریشان کن حالات سے جان چھڑانے کے لئے عملی اقدام اٹھانے شروع کر دیئے۔ میری سب سے پہلی ترجیح یہ تھی کہ اُنہیں جیل کی کلاس C سے کسی طرح نکالا جائے۔ کافی تگ و دو اور مختلف لوگوں سے گفت و شنید کے بعد ہم انہیں کلاس A میں لانے میں کامیاب ہو گئے جہاں قدرے بہتر سلوک اور آسانیاں میسر تھیں اور وہاں جیل کے ایک الگ کمرہ میں اُن سے تنہائی میں ملاقات بھی کر سکتا تھا۔ وہاں میں نے اپنے والد سے پختہ وعدہ کیا کہ جیل

سے جلد سے جلد اُن کی رہائی کے لئے ہر ممکن قدم اٹھاؤں گا۔

اس تکلیف دہ واقعہ نے ہمارے سارے خاندان کو جذباتی اور ذہنی طور پر انتہائی خوفزدہ اور متاثر کر دیا۔ میرے والد پر حکام صرف اس لئے ظلم کر رہے تھے کہ وہ احمدی تھے۔ مجھے جیل میں پڑے ہوئے باقی چھ احمدیوں سے بھی ہمدردی تھی جن سب کو کلاس C میں قید کیا گیا تھا۔ اُن کے بارے میں میں نے حکام سے پُر زور سفارش کی کہ اُنکو بھی کلاس A میں منتقل کر دیا جائے لیکن مجھے بتایا گیا کہ اگر میں یہ کوشش کروں گا تو میرے والد کو دوبارہ C کلاس میں بھیج دیا جائے گا۔ حکام نے مجھے کہا:

”کوئی بھی ایسی کوشش نہ کرنا، تم سے جتنی رعایت کرنی تھی وہ ہم نے کر

دی ہے۔ لیکن اگر تم اس سے زیادہ کوئی اور کوشش کرو گے تو ہمیں مجبوراً

تمہارے والد کو واپس کلاس C کے قید خانہ میں ڈالنا پڑے گا۔“

میں باقی تمام قیدیوں کے لئے بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن بالکل مجبور تھا اور اُن کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔

اگلے بارہ مہینوں میں میں نے اور میرے بھائی نے پاکستانی حکومت کے بار سوخ لوگوں سے ملنے کے لئے کئی بار سفر کیا تا کہ اپنے والد کو قید سے رہا کروا سکیں کہ جن کو قتل کا جھوٹا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ احمدیوں نے قیدیوں کے لئے مشہور وکیلوں کی خدمات حاصل کر لیں تھیں تا کہ عدالت میں حکومت کے خلاف لڑ سکیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صدر ضیاء الحق کے قریبی حلقوں کو اندازہ ہو گیا کہ اُن کی چالیں کام نہیں آ

رہیں، کیونکہ اُن کے پاس مُلزموں کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔

جس وقت میرے والد جیل میں تھے اُن دنوں میری بوڑھی دادی بے جی بہت زیادہ غمگین تھیں اور خود کو تنہا محسوس کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے کھانا پینا بھی بند کر دیا اور 105 سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

”محمد اسحاق کہاں ہے؟ محمد اسحاق کہاں ہے؟“

وہ رورو کر بہت ضعیف آواز میں مجھ سے پوچھا کرتی تھیں۔ اُن کی سب سے زیادہ دیکھ بھال میرے والد نے کی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب تھے۔ حکام نے میرے والد کو اپنی ماں کے جنازے اور تدفین میں شمولیت کی اجازت نہ دی جو کہ احمدیوں کی بستی ربوہ میں ہوئی تھی۔ اُس پر میرے والد بے حد اداس اور مغموم تھے۔ اُنہیں احساس تھا کہ حکومت نے اُن کو ایک بنیادی حق سے محروم کر دیا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی تدفین میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ ویسے اُنہوں نے اپنی والدہ کے جنازے سے متعلقہ تمام انتظامات قبل از وقت کر دیئے تھے۔ ہمارے دادا کی قبر کے ساتھ والا زمین کا ٹکڑا اُن کی تدفین کے لئے خریدا ہوا تھا۔ میت اُٹھانے کے صندوق سے سمیت ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا مکمل بندوبست کیا ہوا تھا۔ اُن کے دل میں اپنی والدہ کے لئے بے حد احترام اور محبت کے جذبات تھے۔ اپنی دادی کے جنازے اور تدفین کے وقت اپنے والد کی غیر موجودگی میرے لئے ایک بہت ہی زیادہ غمناک، مایوس کن اور ہیجانی مرحلہ تھا۔

جس وقت میری دادی نے وفات پائی اُن دنوں میں پاکستان میں ہی تھا۔ یہ میری

خوش قسمتی تھی کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے اپنے والد کی تمام ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق عطا کی۔ میں نے سارے انتظامات کئے۔ ربوہ گیا۔ جنازے میں شامل ہوا اور جو کچھ بھی میرے والد نے اپنی پیاری والدہ کے لئے کرنا تھا وہ تمام کام میں نے احسن رنگ میں ادا کر دئے۔

اُن حالات میں ہم سب کو ایک بار پھر پوری شدت سے احساس ہوا کہ احمدی ہونے کی وجہ سے پاکستان میں ہمارے ساتھ تفریقی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہم اُس ملک کے باشندے نہیں ہیں اور پاکستان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اُس ملک میں احمدی ہوتے ہوئے کیسے رہا جاسکتا تھا جہاں بے گناہ لوگوں کو قتل کے جھوٹے الزام کے تحت جیل میں پھینکا جا رہا ہو؟ اُس وقت کا ڈیکٹیٹر ضیاء الحق احمدیوں سے سخت متنفر تھا اور اُن کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کر چکا تھا۔

ایک سال قید میں رہنے کے بعد میرے والد کو ملٹری کورٹ نے رہا کر دیا۔ یہ فیصلہ ہماری اور جماعت احمدیہ کی متواتر مساعی کے نتیجے میں ہوا جس کے لئے ہمیں حکام کو قائل کرنا پڑا کہ جو واقعہ مسجد میں پیش آیا تھا اُس میں میرے والد کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

والد کی جیل سے رہائی کے سلسلہ میں جب ہم اعلیٰ فوجی حکام سے ملنے جاتے تو وہ

مجھ سے مذاقاً پوچھا کرتے:

”تم تو ایک اچھے بھلے شریف آدمی لگتے ہو۔ تم کیسے احمدی بن گئے؟“

یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ ہمارے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ جواباً میں

صرف اتنا ہی کہتا کہ میں پیدائشی احمدی ہوں۔

1980 کی دہائی کے درمیانی سالوں میں اُن کے ساتھ بے حد تفریقی سلوک کی بنا پر بے شمار احمدیوں کو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑا۔ اُن کو ہزاروں کی تعداد میں پاکستان سے ہجرت کرنا پڑی اور وہ مغربی ممالک میں جا کر آباد ہو گئے۔ میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ جماعت احمدیہ کے افراد کو جب اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو انہوں نے مغربی دُنیا میں مجموعی طور پر بہت سے قابلِ قدر کام سرانجام دیئے۔

میرے خیال میں یہ امر پاکستان کے لئے نقصان دہ تھا کیوں کہ اس طرح پُر امن، محنت کش، حُب الوطن، دیانت دار اور باہمت باشندے وہاں سے نکل کر مغربی ممالک جا رہے تھے اور یہ میرے لئے ایک تکلیف دہ بات ہے کیونکہ مجھے اپنے پیدائشی وطن سے محبت ہے۔

ملٹری کے عدالتِ خصوصی نے باقی چھ افراد کو جو کہ میرے والد کے ساتھ قید کئے گئے تھے، معاف نہیں کیا۔ کورٹ نے احمدی مبلغ محمد منیر اور ساہیوال مسجد کے محافظ رانا نعیم الدین احمد کو سزائے موت کا حکم دیا اور باقی چار افراد میں سے ہر ایک کو سات سات سال کی سزا سنائی اور کورٹ کا وہ فیصلہ پنجاب کے گورنر جنرل غلام جیلانی خان کے پاس برائے تصدیق بھیج دیا گیا۔ گورنر جیلانی نے دیکھا کہ قطعی طور پر بے انصافی کی گئی ہے۔ کیونکہ رانا نعیم صاحب نے خود حفاظت کے طور پر قدم اٹھایا تھا۔ اور دیگر تمام ملزمان میں سے ایک بھی جائے وقوع پر موجود نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جنرل ضیا الحق قطعاً کوئی نرمی دکھانے پر تیار نہ تھا اور چاہتا تھا کہ تمام افراد کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

صرف میرے والد واحد وہ شخص تھے جن کو بے گناہ قرار دیا گیا تھا اور اُن کو جیل سے رہائی ملی۔ اِس کے بعد پاکستان میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنے سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور اُن کے پاس اپنی جائے پیدائش چھوڑنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ اور یہ فیصلہ اُن کے لئے انتہائی دکھ اور غم کا باعث تھا۔

اِس واقعہ کے فوراً بعد ہم اپنے والدین کو کینیڈا لے آئے۔ مگر آج بھی وہ واقعہ مجھے اور ہمارے سارے خاندان کو غم و حزن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہم سب کو اپنی جائے پیدائش اور میراث، پاکستان سے پیار ہے۔ مذہب کے نام پر ظلم و ستم ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اپنے مُحب وطن والدین کو اپنا دیس چھوڑتے دیکھنا میرے لئے ایک تکلیف دہ بات تھی۔ لیکن پُر امن شہری ہونے کی حیثیت سے زندگی جاری رکھنے کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

میری تو یہی اُمید اور دُعا ہے کہ باقی سب لوگ جو ایسی تکالیف کا سامنا کر رہے ہیں اس حقیقت سے کچھ سکون محسوس کریں گے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ میں اپنی جائے پیدائش پاکستان کے لئے بھی نیک خواہشات رکھتا ہوں، وہ آج بھی مجھے عزیز ہے اور اُس سے دلی محبت رکھتا ہوں۔ کیونکہ اُس کے ساتھ میرے بچپن کی بے شمار پیاری یادیں وابستہ ہیں۔ وہیں میں پل کر بڑا ہوا تھا اور وہیں میں نے زندگی کے بہت سارے قیمتی سبق سیکھے تھے۔



محبت سب کیلئے، نفرت کسی سے نہیں

تمام مسلمانوں کی طرح احمدیوں کے بھی وہی پانچ ارکانِ اسلام اور چھ ارکانِ ایمان ہیں۔ احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں میں اعتقادی لحاظ سے کوئی فرق نہیں ماسوائے اس کے کہ ہم حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کو مسیح موعود اور مہدی مانتے ہیں اور اکثر مسلمان حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا آسمان سے اترنے اور مہدی کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں۔

حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام (1835-1908) نے خدا سے حکم پا کر جماعتِ احمدیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ علیہ السلام ہندوستان میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبہ قادیان میں پیدا ہوئے تھے اور خدا نے انہیں دینِ اسلام کی تجدید اور احیاء کے لئے مبعوث فرمایا تھا تا کہ اسلام کی کھوئی ہوئی عظمت وہ دُنیا میں دوبارہ قائم کریں۔ خدا نے انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مثیل کے طور پر بھیجا تھا تا کہ اُن کے ہاتھوں دُنیا میں امن و امان قائم ہو اور اسلام کی تجدید ہو۔ انہوں نے پورے انہماک اور ثابت قدمی کے ساتھ اسلام کے احیائے ثانیہ کا کام شروع کیا، اور اسلام میں مروجہ بدعتوں اور غلط

نظریات کی اصلاح کی اور ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے اسلام کی حقیقی اور خوبصورت تعلیمات پیش کیں۔

1889 میں حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے اعلان کیا کہ وہ (اسلامی) چودھویں صدی کے مجدد، مہدی اور مسیح موعود ہیں جن کے بارے آخری ایام میں ظاہر ہونے کی پیش گوئی آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ 23 مارچ 1889 کے دن بذریعہ بیعت آپ علیہ السلام نے جماعتِ احمدیہ کی بنیاد رکھی۔ ردِ عمل کے طور پر اُن کے مسیح موعود ہونے کے دعوے کی مختلف مذاہب کے رہنماؤں نے سخت مخالفت شروع کر دی، لیکن جماعتِ احمدیہ دن بہ دن ترقی پزیر اور خدمتِ اسلام میں مصروف ہے۔

احمدی دُنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم شائع کر رہے ہیں اور تبلیغ میں سرگرم ہیں تاکہ تمام دُنیا اسلام کے بنیادی عقیدہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں، پر ایمان لے آئے۔ ان تمام حقائق کے باوجود دُنیا میں مسلمانوں کی اکثریت ہمیں مسلمان نہیں سمجھتی اور مسلمانوں کے دوسرے فرقے ہماری مخالفت کرتے ہیں۔

1947 میں ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے بعد احمدی مسلمانوں کی اکثریت ہجرت کر کے پاکستان آ گئی جہاں تعداد کے لحاظ سے آجکل دنیا میں سب سے زیادہ احمدی آباد ہیں۔ ویسے جماعتِ احمدیہ دنیا کے 212 ممالک میں منظم طور پر قائم ہو چکی ہے اور اُس کا بین الاقوامی مرکز برطانیہ میں ہے۔

احمدی مسلمان شروع ہی سے مذہب میں دہشت انگیزی اور کشت و خون کی پُر زور مخالفت کرتے اور اسلام کو ایک پُر امن مذہب کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ مرکزی طور پر ہماری مذہبی اور روحانی رہنمائی نظامِ خلافت کے ماتحت ہے۔ اور حضرت مرزا مسرور احمد، خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز ہمارے موجودہ خلیفہ ہیں، جنکی رہائش برطانیہ میں ہے۔

تاریخی طور پر قادیان میں اپنے ابتدائی ایام ہی میں جماعتِ احمدیہ ظلم و ستم اور مقدمہ بازی کا نشانہ بنائی جاتی رہی ہے۔ اور یہ جارحانہ اقدام بعض سنی مولویوں اور دوسرے مسلمان فرقوں نے اٹھائے تھے۔ سنی مولوی اپنی جہالت میں یہ سمجھتے تھے کہ جب تک وہ تصدیق نہ کریں اُس وقت تک آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔

پاکستان بننے کے بعد خاص طور سے سنی مولویوں نے اپنی مخالفت تیز کر دی اور احمدیوں پر تشدد شروع ہو گیا۔ ایسے مولویوں کا عام رجحان لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کا بھی ایک ہیبت ناک تصور پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا رحمان و رحیم ہے۔ غفار اور تواب ہے۔ لوگوں کے گناہ معاف فرماتا ہے۔ اللودود ہے۔ انسانوں سمیت اپنی تمام مخلوقات سے محبت کرتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان کے احمدیوں کے خلاف نفرت بڑھتی چلی گئی۔ 1977 میں جنرل ضیا الحق نے ملک کی حکومت پر پابجہ قبضہ کر کے مارشل لا نافذ کر دیا۔

اور اُس نے جمہوری طور سے منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو برخاست کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ضیا نے پاکستان کی عوام سے وعدہ کیا وہ نوے دنوں کے اندر ملک میں انتخابات کروائے گا۔ لیکن وہ طاقت اور تکبر کے نشے میں اتنا دھت تھا کہ مارشل لا کی میعاد بڑھاتا چلا گیا۔ اسکے علاوہ اُسے امریکہ سے بہ کثرت مالی امداد بھی ملنا شروع ہو گئی۔ کیونکہ امریکہ چاہتا تھا کہ افغانستان پر 1979 میں سوویت یونین کے حملے کی مدافعت میں پاکستان اُس کا ساتھ دے۔

جیسے سال گزرتے گئے، ضیا نے مضبوطی سے اپنے پاؤں گاڑ لیے اور بہت سارے سخت قوانین بنانے شروع کر دیئے۔ بڑے بڑے ملاؤں اور مذہبی پولیس کی مدد سے اُس نے حدود آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت ہاتھ پاؤں کاٹنے، کوڑے لگانے اور سنگساری کے ذریعہ موت کی دقیانوسی سزائیں جاری کر دی گئیں۔

اپریل 1984ء میں اُس نے اپنا XX Ordinance جاری کیا جو کہ خصوصی طور پر احمدیوں کو نشانہ بنانے اور اُن کی مذہبی آزادی ختم کرنے کے لیے تراشہ گیا تھا۔ ربوہ ٹائمرز کی اطلاع کے مطابق احمدیوں پر اذان دینے، ”السلام علیکم“ کہنے اور اپنی عبادت گاہوں کو ”مسجد“ کہنے پر قانونی پابندی لگائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُن پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے پر بھی ممانعت تھی۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کی اضافی پابندی کی توسیع اور عملداری انتہا پسند اور پُر تعصب ملاؤں اور حاکموں دونوں کے ہاتھ میں تھی۔ احمدیوں کو اپنے پاسپورٹوں پر بھی یہ درج کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ وہ احمدی

ہیں۔ بنیادی طور پر ضیا کی خواہش تھی کہ وہ نعوذ باللہ ”احمدیت کے سرطان کو کاٹ پھینکے۔“

انتہاپسندوں کو سمجھ آ گئی تھی کہ اب وہ احمدیوں کے خلاف جو چاہیں کر سکتے ہیں اور قانونی سزاؤں سے انہیں مکمل بریت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لئے انہوں نے بے خوف ہو کر احمدیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ اُن دنوں سینکڑوں احمدیوں پر مقدمات دائر کئے گئے، انہیں حراست میں لیا گیا۔ جسمانی اور جذباتی تکالیف دی گئیں۔ اس پس منظر میں انتہاپسند ملاؤں کا حوصلہ بلند ہو گیا اور انہوں نے یکے بعد دیگرے احمدیوں پر حملے شروع کر دیئے جس میں مساجد کی بے حرمتی اور وہاں لکھے ہوئے کلمہ طیبہ کو مٹانا یا مکمل طور پر تباہ کر دینا شامل تھا۔

انسانی حقوق کی حامی مشہور نمائندہ خاتون کیرن پارکر کے الفاظ میں:

”جنرل ضیا نے ایک خبیثانہ، نفرت انگیز ایذا رسانی کی مہم کے لئے

احمدیوں کو چُنا۔ اُس نے اور اُس کی انتظامیہ نے کئی بار اپنی تقریروں

میں کھل کر پاکستانیوں کو ابھارا کہ وہ احمدیوں کی تلاش میں رہیں، ان کے

متعلق اطلاع دیں اور اگر اُن کو قتل بھی کرنا پڑے تو کر سکتے ہیں۔“

پاکستان میں اگر کوئی آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی مانتا ہو تو اُسے

کافر قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام ایک

اُمّتی نبی اور مسیح موعود ہیں۔ اس صورت کے پیش نظر ضیا کے مولویوں کو غلط طور پر اختیار

دے دیا گیا ہے کہ جو بھی ان کے اعتقاد کے خلاف کوئی عقیدہ رکھے، اُس کا قتل جائز ہے۔ یہ سب کچھ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہو رہا تھا۔ بد قسمتی سے مذہبی غیر رواداری اور انتہا پسند قومیت نے دُنیا میں پاکستان جیسے ممالک کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور یہ ایک بہت افسوسناک بات ہے کہ بعض لوگ اپنے عقائد کی غلط تشریح کر کے انتہا پسندی کا رویہ اپنالیتے ہیں اور ظلم و ستم اور تفریق پر اُتر آتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں امن پسند افراد کی اکثریت کی زندگی منتشر ہو جاتی ہے۔

پاکستانی سیاست کے پُر آشوب ماضی کے باوجود مجھے اپنے وطن عزیز کی بدلی ہوئی موجودہ صورتِ حال دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ تحریک انصاف کی نئی حکومت ایک بہتر پاکستان بنانے میں کوشاں ہے کہ جہاں مذہبی آزادی، مساوات اور انصاف پروری کو اہمیت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ عنقریب وہ دن آئیں گے کہ جب رنگ و نسل اور نظریاتی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر ایک کو کہ جن میں احمدی بھی شامل ہیں، خوش آمدید کہا جائے گا کہ وہ پاکستان کے حسین ملک میں آکر آباد ہوں یا یہاں سیاحت کے لئے آئیں۔ ہم تمام احمدی امن پسند لوگ ہیں۔ اور ہمارا مقولہ ہے:

”محبت سب سے، نفرت کسی سے نہیں۔“

اور میں اپنی جائے پیدائش، وطن عزیز پاکستان سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔



بڑی حویلی

وچیتا، کینساس، میں جب میرے کاروبار نے ترقی کر کے قدم جمائے تو ہم نے اپنی زندگی کے اگلے مرحلہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ہمارے بچے بڑے ہو رہے تھے اور ہماری خواہش تھی کہ ان کو کسی بڑے شہر کے ماحول میں پالا جائے۔ وچیتا ایک چھوٹا شہر تھا اور ہم نے سوچا کہ کسی ایسی جگہ چل کر رہیں کہ جہاں ہماری احمدیہ جماعت کے لوگ زیادہ ہوں۔ کسی بڑے شہر میں منتقل ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ بُشریٰ اور بچوں کی دوستی کا دائرہ وسیع ہو جائیگا۔ بُشریٰ کے دل میں بچوں کی بہبودی کا خیال تھا کہ نقل مکانی کرنے میں ان کا فائدہ ہے۔

یہ 1985 کا سال تھا اور ہماری سب سے بڑی بیٹی صادیہ کی عمر دس سال، باہر نو سال اور ماریہ ابھی تین سال کی ہوئی تھی۔ ان سب بچوں کی عمریں ابھی چھوٹی تھیں اس لئے کسی جگہ کے ساتھ ان کا کوئی پختہ تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ دوسرے مہاجرین کی طرح ہماری بھی یہی خواہش تھی کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں اپنے علاقے سے آئے ہوئے لوگ رہائش پزیر ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ لاس اینجلس میں احمدی کافی تعداد میں

آباد ہو رہے ہیں اور میرے دل میں سب سے پہلے وہیں جا کر رہنے کا خیال تھا۔ کیلیفورنیا میں بیکرز فیلڈ کے علاقے میں میرے تیل کے کنوئیں بھی تھے اور لاس اینجلس سے میں اکثر وہاں بذریعہ جہاز یا کار چلا جاتا تھا تاکہ وہاں اپنے تیل کے کنوؤں کا معائنہ کروں۔

لاس اینجلس کے بعد میری دوسری پسند ہو سٹن کا شہر تھا جو کہ دنیا کی ارضی توانائی کا مرکز تھا۔ وہاں کے بینک بھی میرے لئے دلچسپی کا باعث تھے جو کہ تیل اور گیس کی کمپنیوں کو قرضے دیا کرتے تھے۔ میں اپنے کاروبار کو مزید ترقی دینا چاہتا تھا جس کے لئے مالی سہولتوں کا موجود ہونا میرے کاروبار کی تقویت کے لئے مدد تھا۔ اس لئے جلد ہی ہو سٹن میری پہلی پسند بن گیا۔

میں نے وچیتا سے اپنے انتظامی کاموں کو مرحلہ وار ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر دسمبر 1985 میں ہم ہو سٹن منتقل ہو گئے۔

میں نے ہو سٹن میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ بعد میں دفتر کے لئے ایک عمارت بھی لے لی۔ میری خواہش تھی کہ تیل اور گیس کی صنعت کے لئے مزید کنوئیں خریدوں۔ وچیتا میں دوسرے لوگوں کے ساتھ شرکت کرنے کے تلخ تجربہ کے بعد میں نے سرمایہ کے حصول کے لئے صرف بینکوں پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ جس کے لئے ہو سٹن ایک اچھی مناسب جگہ تھی۔ اور میں اپنے اس فیصلہ پر بہت خوش تھا۔

چند مہینوں کے اندر بٹری نے بے یونانی علاقے کے نئے ماحول میں اپنی روزمرہ

کی زندگی کو ہم آہنگ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا وقت زیادہ تر بچوں کی ضروریات پورا کرنے اور انکی دیکھ بھال میں گزارتی تھی۔ خاص طور پر اُس کا کام بچوں کو اسکول لے جانا اور پھر وہاں سے واپس لانا تھا۔ اسکول کے اوقات کے بعد وہ اُن کو بچوں کے مختلف مشاغل میں شمولیت کے لئے لے جاتی۔ روزمرہ کے ان کاموں میں جب اُس کا دل لگ گیا تو پھر جلد ہی کینیڈا کی یاد اُس کے ذہن سے ماند پڑ گئی اور اُس کے دل میں امریکہ کی محبت بڑھنے لگی۔ ہوسٹن کے اندرون اور بیرون اُس نے بہت سی نئی سہیلیاں بنالیں۔ اس دوران میرا زیادہ وقت اپنے کاروبار کی نگرانی یا سفر کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

جب ہم ہوسٹن سے اچھی طرح مانوس ہو گئے تو میں نے دو ایکڑ زمین پر بنا ہوا ایک مکان خرید لیا۔ جس کو ہم ”بڑی حویلی“ کہنے لگے۔ یہ کشادہ مکان ہمارے لئے ایک مثالی رہائش گاہ بن گیا، جس میں بُشریٰ کی خواہش اور مرضی کے مطابق سارا خاندان اکٹھا رہ سکتا تھا۔

یہ مکان ہم نے 1990 کے اوائل میں خریدا تھا اور 2002 میں اس کے ساتھ پیوستہ اضافی کمرے بنا کر اُس کو ایک وسیع احاطے میں پھیلا دیا۔ اُس میں 25 خوابگاہیں، 7 باورچی خانے، 12 مہمان خانے، 5 کپڑے دھونے کے کمرے، ایک فلم تھیٹر، دو دودروازوں والے 7 گیراج، تین مطالعہ گاہیں / دفاتر، سات آتش گاہیں کہ جن میں سے بعض دو طرفہ ہیں، نو کھانے کے کمرے ایک ورزش کا کمرہ اور باہر ایک سایہ دار سائبان اور ایک گرم نمکین پانی کا بڑا تالاب ہے۔ اس مکان میں ایک وسیع کمرے کو

افریقہ سے درآمدہ لکڑی سے سجایا گیا ہے جس کو ہم جنگل زبیرا کمرہ کہتے ہیں۔ اس مکان کی 26 فٹ سے لیکر 32 فٹ تک قوسی چھت ہے جسکو فولادی چادروں سے مستحکم کیا گیا ہے۔ ہر کمرے کی دیواروں کا اپنا جدا گانہ رنگ ہے جن پر رنگ دار کاغذ چسپاں ہیں جو سنگ مرمر یا لکڑی کا تصویری تاثر دیتے ہیں۔

خوابگاہوں سے منسلک غسل خانوں کے فرش لکڑی کے اور دالانوں کے فرش سنگ مرمر کے ہیں۔ ضیافت کے بڑے کمرے کی دیوار پر اٹھارویں صدی کے ایک رومن کیتھولک گرجے کا دروازہ نصب ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے تین بڑے دروازے اٹھارہ فٹ اونچے فولاد اور شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ گھر کے مختلف حصوں میں قسم قسم کے پوست انبازی کئے گئے جانور بھی ہیں۔ بھری ہوئی پوست کے ان جنگلی جانوروں میں شیر، چیتا، جنگلی ہلا، بارہ سنگا، زبیرا، ریچھ اور دیگر گونا گوں جانوروں کے علاوہ رنگ برنگ جنگلی پرندے بھی سجے ہوئے ہیں۔ سارے گھر میں مشرقی قالینوں کی بے جا فراوانی ہے اور طرح طرح کے جنگلی افریق پرندے بھی ہیں۔ اتنا بڑا مکان سارے کا سارا ایک ہموار سطح پر ہے ماسوائے چند سیڑھیوں کے جو دوسری منزل تک لیجاتی ہیں۔

اتنے بڑے مکان کی دیکھ بھال کے لئے ایک کل وقتی منتظم کی ضرورت تھی اور بشریٰ نے یہ کام خود سنبھال لیا۔ ایک بڑا خاندان جس طرح پاکستانی دیہات میں باہم منسلک ہو کر یک جا رہتا ہے بشریٰ نے بھی اُسی طرز پر یہ گھر چلانا شروع کر دیا۔ یہاں

بھی وہ پاکستانی طرزِ زندگی کو برقرار رکھنے پر مُصر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہمارے بچے اخلاقی، باحیائی اور معاشرتی رسوم کی پابندی کرنے بلکہ اپنی شادیوں میں بھی پاکستانی طرزِ زندگی کو اپنائے رکھیں۔

جن دنوں میں گھر پر نہ ہوتا اور بچے شرارتیں کرنا شروع کر دیتے جیسا کہ اُس عمر میں عام طور پر بچے کیا کرتے ہیں، تو بُشریٰ اُن کو ڈانٹتی اور کہتی:

”ذرا صبر کرو۔ جب پاپا گھر آئیں گے تو میں اُن کو بتاؤں گی کہ تم نے میری بات نہیں مانی تھی۔“

ہمارے معاشرے میں یہ عام رواج ہے کہ بچوں کو اُن کے والد کے سایہ سے بھی ڈرا کر رکھا جاتا ہے۔ لیکن جو شخص زیادہ وقت گھر سے باہر ہی رہتا ہو تو اُس سے کیا خوف کھانا۔ اس لئے بچوں کے لئے میں ایک بھوت نما چیز بن گیا تھا۔ بُشریٰ کی شکایتیں سننے کے بعد اکثر اوقات میں بچوں کو کچھ نہ کہتا تھا۔ پھر بھی میرے دونوں بڑے بچے، صادیہ اور بابر، بُشریٰ کے ڈرانے کی وجہ سے مجھ سے خوف زدہ رہتے تھے۔ لیکن ہمارے دونوں چھوٹے بچوں کی پیدائش تک بُشریٰ اور میں نے بچوں پر سختی کم کر دی تھی۔ جب ہماری بیٹی ماریہ پیدا ہوئی تو مجھے یاد ہے کہ بہ حیثیت والد میں بے حد نرم دل ہو چکا تھا۔ اور جب یوسف پیدا ہوا تو اُس وقت میں اپنی زندگی کے اُس دور سے گزر رہا تھا جبکہ میرا کاروبار کافی حد تک مُستحکم تھا۔ یوسف کی پیدائش سے پہلے ماریہ میرے بہت قریب تھی۔ میرے ساتھ کھیلتی رہتی تھی اور مجھے دھکے بھی دیتی، کیوں کہ وہ بہت شوخ اور چیخلی

تھی۔ یوسف ہمیشہ میرے بہت قریب رہا ہے اور اگر آپ ہمارے کسی رشتہ دار سے پوچھیں تو وہ یہی کہے گا کہ یوسف ہمارا بے بی ہے۔ بہت چھوٹی عمر ہی سے وہ میرے ساتھ نہ تھی رہتا تھا۔

یوسف کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ صادیہ کی منگنی کے وقت اُس نے میری ٹانگ اتنی سختی سے پکڑ رکھی تھی کہ اُس کی ہتھیلی پر پسینہ آنا شروع ہو گیا، لیکن پھر بھی اُس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اُس کے لئے میرا دل بے حد نرم تھا اور میں مانتا ہوں کہ دوسرے بچوں کے بالمقابل اُس نے بہت زیادہ مزے اُڑائے ہیں۔

میرے بڑے بیٹے بابر کو اکثر اوقات دفتروں کا سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ عام طور پر اُس عمر کے لڑکوں کا حال ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ دیر سے گھر واپس آتا تو بُشریٰ غصے میں مخبوط الحواس ہو جایا کرتی تھی۔ بُشریٰ کو اپنے بچوں کے ساتھ بے حد پیار ہے لیکن وہ اُن پر سختی بھی کیا کرتی تھی۔ ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اُس نے اپنی بھرپور کوشش کی کہ تمام بچوں کو پوری لگن کے ساتھ اور ایک امتیازی طریق سے پروان چڑھائے۔

بُشریٰ کو یہ پسند نہیں تھا کہ ہماری بیٹیاں مغربی طرز کا لباس پہنیں۔ اسلئے اسکول سے واپس گھر آتے ہی اُن کو پاکستانی روایتی لباس شلوار اور قمیض پہننا پڑتا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب وہ بڑی ہونا شروع ہو گئیں تو بُشریٰ اس معاملہ میں نرم پڑ گئی، بلکہ امریکہ کے مغربی لباس اُس کو اچھے لگنے لگے۔

میں نے بشریٰ سے کئی بار پوچھا کہ اتنا عرصہ کینیڈا اور امریکہ میں رہنے کے بعد بھی اُس کو مغربی طرز کا لباس کیوں اچھا نہیں لگتا تھا؟ اور مغربی لباس سے مختلف لباس کس لئے پہنا کرتی تھی؟ جواباً وہ کہتی کہ پاکستانی تہذیب اپنائے رکھنے میں کیا حرج ہے؟ لیکن بعد ازاں بشریٰ کے خیالات میں بھی آہستہ آہستہ تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ پاکستان میں اگر بشریٰ وہاں کی تہذیب چھوڑنا بھی چاہتی تو وہ ایسا نہ کر سکتی تھی، مگر امریکہ میں خصوصاً ہوسٹن آکر میں نے دیکھا کہ اُس پر مغربیت کا تھوڑا بہت اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

بشریٰ نے بچوں کو عربی اور اردو پڑھانے کے لئے اُستاد بھی رکھ لئے تھے تاکہ وہ بچوں کو با ترجمہ قرآن پڑھا سکیں۔ بچپن ہی سے بشریٰ نے اُن کے دلوں میں یہ بات ڈالنی شروع کر دی تھی کہ سارے گھرانے کو آپس میں مل جل کر اکٹھا رہنا چاہیے اور شادیوں کے بعد بھی وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ اسی لئے ہم نے ہوسٹن میں بڑی حویلی خریدنے کا فیصلہ کیا تھا اور اُسے مزید وسعت دے دی تھی تاکہ شادیوں کے بعد بھی ہمارے سارے بچے اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں رہ سکیں اور بلاشبہ وہاں ہم سب کی اکٹھی رہائش کے لئے کافی گنجائش تھی۔

ایک ہی سطح پر بنا ہوا اتنا بڑا مکان جس میں کوئی زیادہ سیڑھیاں بھی نہ تھیں، اُس کی خوشنمائی دیکھنے والے کو بہت اچھا تاثر دیتی تھی۔ اتنے وسیع مکان کو صاف ستھرا رکھنا اور باقی تمام ضروریات مہیا رکھنا کافی مہنگا تھا۔ مگر خدا نے مجھے وسائل عطا فرمائے تھے کہ

میں تمام اخراجات اٹھا سکوں، اور میرا یہی خیال تھا کہ اُس مکان میں رہنے سے میں خوب لطف اندوز ہوں گا۔ بُشریٰ نے اُس گھر کو چلانے کا سارا کام خود سنبھال لیا اور بچوں کو وہاں ایک نظم و ضبط کے ساتھ رہنا سکھایا، اور وہ اُس بڑی حویلی کی کرتا دھرتا بن گئی۔

جیسے جیسے سال گزرتے گئے میں نے صاف طور پر محسوس کرنا شروع کیا کہ اپنے سارے خاندان کو یکجا اور متحد رہنے کے ہمارے منصوبہ میں شگاف پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے بچوں کا ہم پر انحصار تھا اور اُن کو ہر قسم کی سہولت میسر تھی، لیکن ان میں محنت و مشقت اور دل لگا کر کام کرنے کے اصولوں پر عبور نہیں تھا جو کہ میرے نزدیک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے بے حد ضروری ہے اور بعض اوقات میں سوچتا کہ ایک چھت کے تلے اکٹھا رہنے اور اتنے بڑے مکان کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے بُشریٰ سے کہا کہ وہ گھر کے تمام اخراجات پر نظر رکھے۔ مگر اغلباً میری یہ توقع غلط تھی۔ اکثر باتوں میں بُشریٰ اچھی خاصی سوجھ بوجھ رکھتی تھی، مگر جہاں تک پیسوں کے خرچ کو کم رکھنے کا تعلق تھا وہ اُس سے قطعاً بے نیاز تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ از خود اخراجات پر قابو پانے کی کوشش کرے، مگر ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ چند مہینوں کے بعد اخراجات کی بروقت ادائیگی ہونی بھی ختم ہو گئی اور مجھے مجبوراً یہ کام اپنے ذاتی محاسب کے حوالے کرنا پڑا۔ بُشریٰ اُس پر خوش نہ تھی کہ اس طرح اُس کو ایک بڑی ذمہ داری سے فارغ کر دیا گیا تھا۔

ہوسٹن میں اُس دوران اپنے کاروبار کو مزید ترقی دینے کے کئی مواقع ہاتھ آئے۔ میں نے تیل اور گیس کی معدنیاتی زمینیں خریدنے کے علاوہ تیل نکالنے کے معاونی حلقے بنانے اور جائیداد خریدنے کے کاروبار بھی شروع کر دیئے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں تیل کے کافی صفت کام پر پورا انحصار نہیں کر سکتا۔ اس لئے غیر منقولہ جائیداد خریدنے کے کام کو بھی جاری رکھا تا کہ تیل کے کاروبار میں اونچ نیچ کے بالمقابل ایک مالی تحفظ حاصل رہے۔

شروع میں مجھے کافی زور لگا کر خود کو منظم رکھنے، محنت سے کام کرنے اور بروقت قرضوں کی ادائیگی کی عادت کو برقرار رکھنا پڑتا تھا۔ کام کرنا میرے لئے سب سے زیادہ خوشی کا باعث بن گیا تھا اور یہ خوشی میں جہاں بھی ہوتا میرے ساتھ رہتی، چاہے میں سفر ہی کیوں نہ کر رہا ہوتا۔

دن رات کام کرنے کی عادت نے مجھ پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا۔ کام کی وجہ سے میری نیندیں حرام نہیں ہوتیں۔ ہاں البتہ اگر مجھے کوئی کام بروقت ختم کرنا ہو تو اُسے میں کبھی بھی پس پشت نہیں ڈالتا اور آدھی رات کو اٹھ کر اُسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہوں۔ عام طور پر عادتاً میں چھ سات گھنٹوں سے زیادہ رات کو نہیں سوتا۔ اور میں نے کبھی بھی کوئی نیند آور دوائی استعمال نہیں کی۔ اکثر اوقات میں ہفتے کی چھٹی کے روز بھی آدھا دن کام کرتا رہا ہوں۔ مگر اب گزشتہ چار سالوں سے میں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا ہے تو دفتر میں کوئی دوسرا بھی ہفتے کے روز نہیں آتا۔

میرا کاروبار ترقی پذیر تھا، اور ہم سب گھر والے اکٹھے چھٹیوں پر چلے جاتے۔ یورپ کی سیر کرنا سب سے زیادہ پسندیدہ تھا۔ اُس کے علاوہ ہر سہ ماہی میں ایک بار وینکوور، ہوائی اور نیویارک چلے جایا کرتے تھے۔ میں نئے ممالک اور اُنکے معاشروں کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے سے لطف و اندوز ہوتا۔ لیکن بُشریٰ کو وہاں جا کر صرف چیزیں خریدنا اچھا لگتا تھا اور وہ وہاں کے شاپنگ مالوں اور دکانوں کی سیر کیا کرتی تھی۔ اکثر میری خواہش ہوتی کہ ہم تھوڑا سا وقت باہم مل کر متفقہ دلچسپیوں کے بارے میں بات چیت کریں، کیونکہ دوسری تہذیبوں کا تاریخی جائزہ لینا مجھے اچھا لگتا تھا۔ مگر ہماری قسمت میں یہ نہیں لکھا تھا۔

اپنے رشتہ داروں سے ملنے ہم اکثر وینکوور چلے جاتے۔ سن 2000 میں ایک ایسے ہی سفر کے دوران ہمارا ایک قریبی رشتہ دار میرے پاس آیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ انہی دنوں میں اُس کو اُس کے کام سے فارغ کر دیا گیا تھا اور اُس نے اپنی آمدن کے لئے ٹیکسی چلانی شروع کر دی تھی۔ مجھے اُس کی حالت پر بہت رحم آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مکانوں اور عمارتوں کی مرمت اور دیکھ بھال کرنے میں ماہر ہے۔ میں اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا، اس لئے آئندہ چند مہینوں میں میں نے وینکوور میں دو عمارتیں خرید لیں اور اُس کو اُن کا منتظم مقرر کر دیا۔ اُس نے فوراً بہت محنت کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اُس کے بعد میں نے کینیڈا میں جائیدادوں کی خرید و فروخت کی ایک کمپنی کھول لی جس سے مجھے کافی فائدہ پہنچ رہا ہے۔

نرم دلی کے ساتھ کسی دوسرے کی تھوڑی سی مدد کرنے کا مجھے بہت اچھا صلہ ملا، نہ صرف مالی طور پر بلکہ اُس سے بہت زیادہ دلی طور پر۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب بھی میں ذاتی غرض کے بغیر کسی کی مدد کرتا ہوں خدا تعالیٰ مجھے ہمیشہ اُس سے بہت زیادہ نوازتا ہے جتنا کہ میں نے کسی دوسرے پر خرچ کیا ہو۔



طوفانِ ہاروی کی تباہ کاریاں

21 اگست 2017ء کو طوفانِ ہاروی ہوسٹن آن پہنچا۔ جب طوفانی بارش نے پورے زور سے برسنے شروع کیا، اُس وقت میرا بڑا بیٹا باہر گھر میں اکیلا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہماری بڑی حویلی کی نچی منزل مکمل طور پر پانی میں ڈوب گئی۔ میں اُس وقت وینکوور میں تھا۔

جب باہر نے دو فٹ اونچے پانی کی تصویریں بھیجنا شروع کیں تو میں نے اُسے کہا کہ وہ فوراً گھر سے باہر نکل جائے، مگر وہ ایسا کرنے پر تیار نہ تھا کیونکہ ہمارے دو جرمن شیفرڈ کتے تھے، وہ پہلے اُن کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اُن دونوں کو مہمان خانے کے اوپر دوسری منزل میں لے گیا اور یہ تسلی کرنے کے بعد کہ دونوں گتے محفوظ ہیں، وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ اونچے پانی میں پہلے تو وہ پیدل چلتا گیا اور پھر تقریباً دو بلاک تک اُسے تیرنا پڑا اور بالآخر صادیہ اور اُس کے خاوند اعجاز نے اُس کو پانی سے باہر نکالا اور اپنے گھر لے گئے۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں واپس ہوسٹن پہنچا تو دیکھا کہ بڑی حویلی کے تمام فرش

بالکل تباہ ہو چکے تھے اور لاکھوں ڈالر کا نقصان تھا جس سے میں انتہائی رنجیدہ ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے! چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی زندگی کی بے شمار خوشگوار یادیں تلف ہو گئی تھیں۔

ہمارے گھر کا تقریباً تمام قیمتی اثاثہ، فرنیچر، میزیں، گرسیاں، ویڈیوز، فیملی کی انمول تصاویر، تمام ساز و سامان، ساری لائبریری، مشرقی قالین اور پُرانے وقتوں کی دیگر قیمتی اشیاء سب کی سب ضائع ہو گئی تھیں۔ نقش و نگار سے آراستہ تمام کمروں میں آویزاں تصویریں شاہکار بھی تباہ ہو گئے تھے۔ لاکھوں کے نقصان کا تدارک کرنے کے لئے کوئی انشورنس کمپنی بھی تیار نہیں تھی کیونکہ یہ غیر متوقع نقصان طوفانی بارش سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری تمام کاروں میں بھی پانی بھر گیا تھا۔

بہر حال میں رضا بہ قضا تھا اور یہی سوچتا تھا کہ وہ تمام دنیاوی چیزیں تھیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور ہم سب زندہ اور محفوظ ہیں۔ لیکن بُشری کے لئے یہ انتہائی مشکل دن تھے۔ کیونکہ بڑی حویلی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ساتھ اُس کا ایک جذباتی تعلق تھا اور یہ وہ مکان تھا جس میں ہم سب باہم مل جُل کر بیس سالوں سے زیادہ مدت تک رہ چکے تھے۔ اُس مکان کی اتنی بڑی تباہی خاص طور پر بُشری کے لئے ایک دل توڑ دینے والا سانحہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد میرے دل میں قدرت کی عظیم الشان طاقتوں کا احترام بہت زیادہ بڑھ گیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے میرے ایک دوست نے مجھے اطلاع دی کہ اُس کا

ایک قریبی دوست فلوریڈا میں سیلاب آنے کی وجہ سے بہت خطرے کی حالت میں رہ رہا ہے۔ میں نے اُس کے دوست کو اپنے ایک مکان میں آ کر رہنے کی دعوت دی اور اُسے کہا کہ جب تک اُسکو اپنی رہائش کے لئے کوئی دوسری جگہ نہیں ملتی وہ وہاں جتنا عرصہ چاہے رہ سکتا ہے۔ اس سے پہلے میری سوچ ایسی نہ تھی۔ لیکن قدرتی تباہ کاریوں کے نتیجہ میں مصیبت زدگان کے لئے میرے دل میں اب ایک نئی نوعیت کا احترام پیدا ہو گیا ہے۔ جب کوئی شخص خود اس قسم کے تکلیف دہ حالات میں سے گزرا ہو تو پھر اس کا اندازِ فکر بدل جاتا ہے۔

جب ہماری بڑی حویلی سیلاب کی زد میں آئی تھی تو اُس وقت مجھے خیال آتا تھا کہ شاید خداوند تعالیٰ نے مجھے سزا دی ہے۔ لیکن پھر میں نے دل کو تسلی دی کہ ہمارا خدا تو پیار کرنے والا خدا ہے۔ میں نے سوچا کہ صرف ہمارا گھر انا ہی نہ تھا بلکہ ہزاروں، لاکھوں دوسرے لوگ بھی متاثر ہوئے تھے اور سخت تکلیف میں تھے۔ میرے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا کہ خدا نے چھوٹے بچوں، جانوروں اور بے حال غریب لوگوں کو کس لئے سزا دی! اس کا یہ جواب مجھے سمجھ آیا کہ یہ کوئی سزا نہیں تھی، بلکہ اس طرح لوگ ایک دوسرے کے اور قریب آ جاتے ہیں اور ہر شخص کے کردار کے بہترین پہلو نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

سارے کا سارا ہوسٹن شہر جس طرح باہم متحد ہو گیا تھا وہ ایک نادر اور ناقابلِ بیان حقیقت ہے۔ شہر کے منتظمین اور شہریوں نے پورے خلوصِ دل کے ساتھ ایک دوسرے

کی اعانت کی۔ اور آج کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ چند سال قبل یہاں کس قدر تباہی آئی تھی۔

دوسروں کے بالمقابل میں خود کو بے حد خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اُن کی اس طوفان میں ہر ایک چیز برباد ہو گئی تھی۔ بے شک اس قسم کی تباہیاں بہت زیادہ درد اور مصیبت کا باعث ہوتی ہیں، لیکن میں ہمیشہ یہ اُمید رکھتا ہوں کہ یہ بربادیاں دنیا کی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں بھی مددگار ہو جاتی ہیں اور انسانوں کے باہمی محبت اور اتحاد کو قائم کرنے میں بے حد مدد ثابت ہوتی ہیں۔



جماعت احمدیہ کی خدمت میں نذرانہ

بچپن ہی سے میری خواہش تھی کہ انسانوں کی خدمت کیا کروں۔ میں ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنا چاہتا تھا، کیونکہ میرا ایمان تھا کہ ایسا کرنا کا ثواب ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تکریم کے اظہار کے لئے میرے خیال میں صلہ مندی ایک لازمی امر تھا۔ میرے والدین بھی ہمیشہ مجھے کہا کرتے تھے جو شخص اللہ کا گھر بنانے میں مدد کرتا ہے، اُس کو اللہ جنت میں ایک گھر عطا کرتا ہے۔

1985 میں ہوسٹن میں صرف چند احمدی گھرانے تھے اور میرا دل چاہتا تھا کہ ہم سب آپس میں باہمی میل جول رکھنے کے لئے کسی ایک جگہ جمع ہو جایا کریں۔ اس لئے جب میں ہوسٹن آیا تو اپنے گھر کے قریب ہی ایک کلب ہاؤس کرایہ پر لینا شروع کر دیا، جہاں ہم سب اتوار کے روز بعد از دوپہر اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

شروع میں تو صرف دو گھرانے تھے، لیکن آہستہ آہستہ دس سے زیادہ ہو گئے اور ہمیں کوئی بڑی جگہ تلاش کرنا پڑی۔ ہوسٹن کے شمالی علاقے میں میں نے ایک جگہ ڈھونڈ کر خرید لی اور وہاں ہوسٹن کے احمدیوں کی پہلی عبادت گاہ بنانے کی مہم کا آغاز

ہوا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ علاقہ آبادی سے دُور اور زمین بہت تھوڑی ہے۔

ایک دن رُوٹ 45 اور رینگلن پر ڈرائیو کرتے ہوئے میری نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا: ”زمین برائے فروخت۔“ میں نے فوراً اُس زمین بیچنے والے کو فون کیا اور چند دنوں میں دس ایکڑ زمین خرید لی۔ اور اُس میں سے پانچ ایکڑ زمین جماعت احمدیہ ہوسٹن کو تحفہ پیش کی تاکہ اُس پر ایک نئی مسجد بنالی جائے۔

دو سالوں کے بعد ہوسٹن جماعت کے عہدہ دار میرے پاس آئے اور بتایا کہ اُن کے پاس مسجد تعمیر کرنے کے لئے رقم نہیں ہے۔ نتیجہ میں نے جماعت احمدیہ امریکہ کو اطلاع دی کہ ہوسٹن میں نئی مسجد میں بناؤں گا۔ اُس کے ساتھ میں نے یہ بھی درخواست کی کہ مجھے کسی کمیٹی کے بغیر از خود مسجد بنانے کی اجازت دی جائے جسکو میں اپنی سوچ اور خواہش کے مطابق بناؤں۔ محترم امیر صاحب نے میری درخواست قبول کر لی۔

30 جون 1998 کو مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ خود ہوسٹن تشریف لائے۔ اُس موقع پر ہنبل کا میئر، ٹومبال کا میئر اور ہوسٹن کے میئر کا نمائندہ بھی حاضر تھے۔ لوگوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ سے درخواست کروں کہ وہ مجھے میری اپنی پسند کا نئی مسجد کا نام رکھنے کی اجازت عطا فرمائیں، مگر میں نے سوچا کہ اس نئی مسجد کا نام حضورؐ خود اپنی مرضی سے رکھیں اور حضورؐ نے اُس کا نام ’بیت السمع‘ تجویز فرمایا۔

میں نے مسجد کی تعمیر کے اخراجات اٹھائے اور تعمیر کے دوران نظامت کا کام کیا۔ مارچ 2004ء میں مسجد کی تکمیل ہونے پر اُسکی چابیاں مقامی جماعت احمدیہ کے حوالے کر دیں۔ میں نے ہوسٹن کی بیت السمع مسجد اپنی ذاتی پسند کے مطابق بنائی تھی اور میرے خیال میں وہ بہت خوبصورت مسجد ہے۔

مسجد کا 54.5 فٹ اونچا منارہ ہے اور اس کا گنبد 42.5 فٹ اونچا ہے۔ گنبد کا اندرونی قطر دائرہ 10 فٹ ہے۔ مسجد اتنی وسیع ہے کہ اسکی 72 کھڑکیاں اور سات دروازے ہیں۔ اور وہاں 800 سے زیادہ لوگ بہ یک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ پارکنگ کے احاطے میں کسی بھی موسم میں 250 کاروں کے لئے جگہ موجود ہے۔

اُس وقت امریکہ میں جماعت احمدیہ کے مرکز کی طرف سے مجھے ہوسٹن جماعت کے صدر بننے کی بھی دعوت ملی تھی، لیکن میں نے انتہائی ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میں یہ ذمہ داری لینے کے لائق نہیں ہوں۔ مسجد کی تکمیل پر مجھے ہوسٹن اور دوسرے علاقوں سے بکثرت ٹیلیفون اور خطوط موصول ہوئے جن میں اس کار خیر کی تعریف کی گئی تھی۔ میں انتہائی انکساری کے ساتھ جماعت احمدیہ ہوسٹن کے تمام احباب کی امداد، نیک خواہشات، دعاؤں اور پوری جماعت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کے بغیر میں مسجد تعمیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔

اس بات کی مجھے انتہائی خوشی ہے کہ ہوسٹن میں اب ہمارے پاس ایک مسجد ہے جہاں ہر کوئی آکر نماز ادا کر سکتا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی مسرت ہے کہ جو زمین میں

نے بطور تحفہ پیش کی تھی اور جس پر بیت السمع وجود میں آئی، وہ مقامی جماعت کے لوگوں اور دوسرے احمدیوں کے لئے ایک اچھی شاندار جگہ بن چکی ہے، جہاں آجکل تقریباً تین چار سو افراد نماز ادا کرتے ہیں اور ہمارے جماعت کی انتظامی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ یہاں احباب جماعت کو جمعہ کی نماز ادا کرنے اور خطبہ سننے اور اتوار کے دن بچوں کی کلاسیں اور خواتین کے اجلاس منعقد کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں عید کی نماز ادا کرنے کی سہولت بھی میسر آگئی ہے اور اس کے علاوہ دوسرے اجتماعات بھی یہیں ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہوسٹن جماعت کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مسجد کے ساتھ ملحقہ زمین اور اس پر ایک گرجے کی عمارت بھی میری ملکیت میں ہیں جو کہ میں نے ایک عیسائی چرچ کو کرایہ پر دیا ہوا ہے۔ کسے معلوم کہ گرجے اور مسجد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ پر دوہری رحمت فرمائے۔



دماغِ غیر مصفّٰا۔ پارکنسن اور نسیان

یہ 10 جون 2014 کا دن تھا اور میرا دماغ پریشانی سے بھرپور تھا۔ مختلف خیالات میرے ذہن میں سرگردان تھے جو کہ میرے معمول کے خلاف بات تھی۔ میری توجہ منتشر تھی۔ میں ایک اطلاع کا منتظر تھا جس میں پہلے ہی سے 24 گھنٹوں کی تاخیر ہو چکی تھی۔

صبح دس بجے کے قریب میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بُشری کے ڈاکٹر نے جو کہ دماغی امراض کا معالج تھا مجھے یہ تشویشناک خبر سنائی کہ اُس کی بیماری کی تشخیص پارکنسن ہوئی ہے۔ جو کہ ایک خطرناک اعصابی مرض ہے اور انسان کی حرکات اور یادداشت کو بے ہنگم کر دیتا ہے۔

چند دن پہلے بُشری ہوسٹن کے میتھوڈسٹ ہسپتال میں دماغ کا سکین کروانے گئی تھی۔ دماغی امراض کے ڈاکٹروں نے Dat Scan کروانے کی ہدایت دی۔ جس میں ایک مخصوص دوائی خون کی نالی میں داخل کی جاتی ہے تاکہ ڈاکٹر ایک کیمیائی مادہ کو جو حرکات کو قابو میں رکھتا ہے باسانی تصویریں طور پر دیکھ کر مرض کی تشخیص کر سکیں۔ بُشری

کے دماغ کی تصاویر دیکھ کر ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ اُس کے جسم کی بائیں جانب اکڑ چکی ہے جو کہ پارکنسن مرض کی واضح نشاندہی تھی۔

ڈاکٹر نے جو کہ میرا دوست ہے، بڑے افسردہ لہجہ میں مجھ سے کہا:

”میں تمہیں یہ پریشان کن اطلاع کل نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا

کہ ایک دن انتظار کروں۔“

مگر اُسے کیا معلوم کہ وہ 24 گھنٹے میری زندگی کے سب سے لمبے اور سب سے زیادہ پریشان کن گھنٹے تھے۔ بشریٰ کو یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا؟ اُس کی وجہ کیا تھی؟ کیا

خدا اُس کو سزا دے رہا تھا؟ کس واسطے؟ کیوں؟ اور اب آگے کیا ہوگا؟

بشریٰ نے اپنی ساری زندگی اپنے بچوں اور خاندان کے لئے وقف کی ہوئی تھی۔

وہ ثابت قدمی سے میرے ساتھ رہتی رہی۔ اُس کا مجھ پر انحصار تھا۔ گذشتہ 25

سالوں میں بارہائیں اُسے یہی کہتے ہوئے سُنتا چلا آ رہا تھا کہ:

”میں تم سے پہلے مرنا چاہتی ہوں اور میری دعا ہے کہ تمہارے بغیر میں

ایک دن بھی زندہ نہ رہوں۔“

میں ہمیشہ اُسے یقین دلاتا کہ مجھے کچھ بھی ہو جائے کوئی نہ کوئی ضرور اُس کا خیال

رکھے گا اور حالات ٹھیک رہیں گے۔

میں اُس کے لئے چین اور سکھ کی زمین تھا، ایک نجم الثاقب تھا جس کی موجودگی

میں وہ خود کو محفوظ تصور کرتی تھی کہ میں اُس کا خیال رکھتا ہوں اور روزی مہیا کرتا

ہوں۔ لیکن میں اس سے بالکل بے خبر تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔
میں نے اپنی زندگی میں پارکنسن کے مرض کے متعلق کبھی بھی کوئی تحقیق نہ کی تھی
کیونکہ کبھی اس کی ضرورت ہی پیش نہ تھی۔ جب بُشریٰ کے میڈیکل ٹیسٹ ہونے شروع
ہوئے اُس وقت بھی میرا دھیان اُس طرف نہیں گیا کہ میں آئن لائن جا کر اس مرض کے
بارے میں معلومات حاصل کروں۔ میری شدید آرزو اور اُمید یہی تھی کہ بُشریٰ کے تمام
ٹیسٹ کوئی اچھی خبر لائیں گے۔ خاندان میں بھی کسی دوسرے کو یہ مرض کبھی لاحق نہ ہوا
تھا اور نہ ہی کوئی اور وجہ تھی کہ میرا ذہن اُس طرف جاتا۔

بُشریٰ کی مہلک بیماری کی اطلاع ملنے کے بعد میں شکست خوردگی کے عالم میں
واپس گھر لوٹا۔ اور اپنے کشادہ مکان کے برآمدے میں ادھر ادھر ٹھہرتا رہا۔ اُس مکان
میں سیڑھیاں نہیں بنائی گئی تھیں تاکہ بڑھاپے میں ہمیں سہولت رہے۔ میں روتا رہا کیونکہ
مجھے معلوم تھا کہ یہ مرض لا علاج ہے۔ بالآخر اُس کی ساری یادداشت ختم ہو جائے گی اور
جسمانی حرکات بھی کمزور پڑ جائیں گی۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ اب بُشریٰ
کی بار آور زندگی کے سفر کا اختتام شروع ہو چکا تھا۔

وہ اپنی صحت کے متعلق کافی محتاط رہتی تھی اور صحت مندانہ طرز زندگی گزارتی تھی۔
اس لئے میرے لئے یہ سمجھنا یا یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ بُشریٰ کو
میں ابھی کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا، اس لئے میں آدھے گھنٹے تک بالکل خاموش بیٹھا
رہا۔ میری زندگی کی تمام کامیابیاں مادی نوعیت کی تھیں، لیکن جو کچھ میں نے ابھی

سنا تھا اُس کے بالمقابل میری تمام اُمنگیں اور مال و دولت مدھم پڑ گئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے چاروں بچوں کو بلا کر اس خبر سے مطلع کروں۔ جس وقت میں اُن کے آنے کا انتظار کر رہا تھا اُس وقت گھر ایک مُردہ خانہ کی مانند تھا سڑوں پر تاریک بادل چھایا ہوا تھا اور گھر میں ایک دل ڈبونے والی خاموشی طاری تھی۔ بُشریٰ جان گئی تھی کہ ضرور کوئی بات ہے کیونکہ ہمارے بچے دوپہر کے کھانے کے وقت سے قبل بہت کم ہی گھر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ اور اُسے یہ بھی احساس تھا کہ میں بہت زیادہ متفکر ہوں۔ کیونکہ میں اپنا غم چھپا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے پوچھنا شروع کر دیا کہ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ اُس کو پارکنسن کی بیماری ہے۔ اُس نے پوچھا کہ پارکنسن کی بیماری کیا ہوتی ہے؟ میں نے اُسے بیماری کے متعلق بتایا اور کہا کہ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا تا کہ وہ اس بیماری کے لئے ضروری ادویات لکھ دے۔ وہ چونکہ پہلے ہی کافی پریشان تھی اس لئے میں اُسے اس بُری خبر کو پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

اُس کے سامنے بچوں نے بھی اپنے غم کو قابو میں رکھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے وقت پر اور اپنے طرز پر غم کھائے گا۔ ہمارے تمام بچے بہت نرم دل اور ہمدرد تھے اور اپنی بلوغت کی عمروں کو پہنچ چکے تھے، لیکن پھر بھی اُن کو اپنی ماں کے متعلق ایک انتہائی پریشان کن اطلاع کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

چند دنوں کے بعد ہم اُسے ایک دماغی امراض کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور اُس

نے لیو وڈو با دوائی کا نسخہ لکھ کر دیا جو کہ پارکنسن کے مریضوں کو کپکپاہٹ، حرکات اور رعشہ پر قابو پانے کے لئے دی جاتی ہے۔ بُشری کے ڈاکٹر نے کہا اس دوائی کو پہلے چھوٹی مقدار میں استعمال کر کے دیکھتے ہیں کہ کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ کیا ایسا کوئی طریق علاج ہے جس سے اس بیماری کو بڑھنے سے روکا جاسکتا ہو؟ ڈاکٹر نے کہا:

”افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بد قسمتی سے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ہے کیونکہ مختلف لوگوں پر اس مرض کا اثر مختلف طور سے پڑتا ہے۔“

ابھی تک ایسی کوئی حیرت انگیز دوا ایجاد نہیں ہوئی جو پارکنسن کے مرض کا علاج ہو۔ لیکن مختلف طریقوں سے اس کے ساتھ نباہ کیا جاسکتا ہے۔ ہم سب بے حد مضطرب تھے، لیکن پھر بھی پُر امید تھے۔ اگلے چند مہینوں میں میں اُسے چار مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے گیا جن کا شمار ہوسٹن میں پارکنسن مرض کے ماہر معالجوں میں ہوتا تھا۔ اور اسی طرح میں اُسے ٹورانٹو، کینیڈا میں ایک عالمگیر شہرت کے ڈاکٹر کے پاس بھی لے گیا۔ اور وہ تمام کے تمام اسی نتیجہ پر پہنچے کہ ہر ایک مریض الگ نوعیت کا ہوتا ہے اور وقت آنے پر ہی مرض کے صحیح اثرات کا پتہ چلتا ہے اور اُس کے لئے انتظار کئے بغیر کوئی دوسرا چارہ نہیں۔ ایک ڈاکٹر نے مریضوں کے تعلق سے اپنے مختلف تجربات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ بعض مریضوں نے تشخیص کے صرف تین مہینوں کے بعد ہی چلنا پھرنا ختم

کر دیا تھا۔ بعض اپنی یادداشت مکمل طور پر کھو بیٹھے۔ بعض بات چیت کرنے سے قاصر ہو گئے اور بعض مریض ایک لمبے عرصے تک اچھی یادداشت کے ساتھ زندہ رہے، ماسوائے اس کے کہ اُن کے جوڑوں میں سختی آگئی تھی۔

گھر میں میں سوچتا رہتا تھا کہ کسی طریقے سے پتہ لگا سکوں کہ یہ مرض کس وقت اور کن وجوہات کی بنا پر اُس کا دامن گیر ہوا تھا۔ تقریباً بیس سال پہلے بُشریٰ اپنے سر میں جلن ہونے کی شکایت کیا کرتی تھی اور یہ عجیب سی جلن سر کے ایک حصے سے گھوم کر دوسرے حصے میں چلی جایا کرتی تھی۔ ہم اُسے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے گئے اور کم از کم تین بار MRI بھی کروایا، مگر سب کی یہی رائے تھی کہ وہ ٹھیک ہے۔

پھر تقریباً 15 سال قبل اکثر اوقات بُشریٰ نے اپنی کمر اور ریڑھ کی ہڈی میں درد کی شکایت کرنا شروع کی۔ میں اُسے دماغ اور ہڈیوں کے مختلف معالجوں کے پاس لے گیا مگر کوئی بھی اُس درد کی اصل وجہ کی وضاحت نہ کر سکا۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ پارکنسن کے ابتدائی آثار ہوں!

ایک دفعہ اپنے گھر کے قریب ایک پارک میں سیر کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اُس کے جسم کے بائیں طرف کے حصہ میں قدرے سختی ہے۔ کیونکہ جب کوئی چل رہا ہو تو اُس کا دایاں اور بائیں بازو یکساں طور پر ایک مناسبت کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ مگر بُشریٰ کے بائیں بازو میں سختی تھی اور جسم کی دوسری حرکات کے ساتھ اُس کی حرکت میں مناسبت نہ تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا:

”تم اپنا بایاں ہاتھ کیوں نہیں ہلاتی؟ کیا کوئی تکلیف ہے؟“

لیکن اُس نے جواب دیا:

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

لیکن مجھے شک تھا کہ کوئی خرابی ضرور ہے۔ ایک دن وہ ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی اور اُس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ میں اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور چند مہینوں کی جسمانی کسرت کے بعد وہ اُس حادثے کے اثرات سے شفا یاب ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اُس کی صحت مکمل طور پر بحال نہیں ہوئی۔

یہ جنوری 2014 کے مہینے کی ایک روشن صبح تھی اور سورج کی پہلی کرنیں ہماری خوابگاہ کی کھڑکی سے آہستہ آہستہ داخل ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ صبح کے سات بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے بستر سے اُٹھا اور بُشریٰ کو دیکھا کہ وہ تکلیف میں تھی۔ اُس کے ہاتھ اور پاؤں سب اکڑے ہوئے تھے اور وہ درد کے مارے رو رہی تھی۔ اُس کو بستر سے باہر نکلنے میں بھی کافی وقت لگا۔ درحقیقت یہ وہ وقت تھا جب اُس کی صحت کے ایک انتہائی مشکل مرحلے کی ابتداء ہوئی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اُس کو دوبارہ دماغی امراض کے معالج کے پاس لیجانا ضروری ہو گیا ہے۔

لیکن وہ ڈاکٹروں کے پاس جانے اور ادویات کھانے کی سخت مخالف تھی اور کہا کرتی تھی کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ میں کوئی دوائی نہیں کھاؤں گی اور میں اُسے سمجھانے

میں ہمیشہ ناکام رہتا کہ وہ اپنی زندگی بھر کی پریشانی کے علاج کے لئے معالج کے پاس جایا کرے۔ لیکن مجھے یہی خدشہ تھا کہ وہ اب بھی ضد کرے گی اور انکار کرے گی۔
بُشریٰ کے خیال میں علاج معالجے کا فن ایک بے کار ایجاد تھی۔ وہ اپنے معالجین بدلتی رہتی تھی اور اُن کو اپنی زندگی کے حقائق سے کبھی بھی آگاہ نہ کرتی۔ وہ اُس سے سوال کرتے، لیکن وہ جواب دینے سے انکار کر دیتی۔

ایک دفعہ اس خیال سے کہ شاید وہ کسی عورت سے گھل کر بات کرے گی اور اپنی بے چینی کا علاج تلاش کرے گی، میں نے ایک خاتون معالجہ کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن بُشریٰ اپنے خیال پر اڑی رہی کہ علاج کرنے والے سب بے کار اور پاگل ہوتے ہیں۔ میری یہی حسرت رہی کہ کاش وہ ان سے دل کھول کر باتیں کرتی تو یقیناً اس طرح اُس کا اپنا فائدہ ہوتا۔ اور وہ بچپن میں جن تکلیف دہ حالات سے گزری تھی اُس کا مداوا ہو جاتا۔ اور شاید اُس کی موجودہ ذہنی اور بدنی حالت میں بھی افاقہ ہو جاتا۔

بُشریٰ کی یادداشت دن بہ دن کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ گزشتہ چار سالوں سے اُس کا حافظہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے، جیسے ہم بلیک بورڈ پر سے لکھی ہوئی تحریریں بچوں کے جانے کے بعد مٹا دیتے ہیں اور صرف دھندلائے سے نقوش باقی رہ جاتے ہیں۔ یادداشت کا اس طرح ماند پڑنا دوبارہ بحال نہیں ہو سکتا۔

آج میں ایک ستر سالہ عورت کے جسم میں ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ بُشریٰ کا بچوں جیسا دماغ اُس کے ماضی کی یادیں واپس لے آتا ہے۔ چند

مہینے پہلے وہ آپ سے باہر ہو جایا کرتی تھی اور اُس پر غصے کے دورے پڑتے تھے۔ لیکن اب وہ زیادہ وقت خاموش رہتی ہے اور جسمانی دردوں کی شکایت کرتی ہے۔ کبھی غصہ میں آجاتی ہے، جملے دُہراتی ہے۔ جلد چڑچڑی ہو جاتی ہے اور چھوٹے بچوں کی طرح شرارتیں کرنا شروع کر دیتی ہے۔

سینتالیس سالوں سے میری بیوی اب فقط ایک خالی پوست بن کر رہ گئی ہے اور وہ نہیں رہی جسے میں جانتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو پہچانتی ہے مگر اُنکے نام اُسے یاد نہیں رہتے۔ ابھی چند دن ہوئے اُس نے مجھ سے پوچھا:

”وہ تمہارا بڑا بیٹا... اُس کا کیا نام ہے؟“

میں نے کہا: ”بابر“

اُس سے کہا:

”آج اُس نے مجھے کال کیوں نہیں کی؟ وہ کہاں ہے؟“

”بابر کیلینفورنیا گیا ہوا ہے۔“

میں نے اُسے بتایا۔ لیکن یہ بات اُسے بغیر کسی تردد کے معلوم ہونی چاہیے تھی۔

اُس کی یادداشت ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اور دن بہ دن یہ حالت بدلتی رہتی ہے۔

اگر آپ بشری کے عین سامنے ہوں تو وہ آپ کو پہچان لے گی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد آپ پھر اُس کے حافظے سے محو ہو جائیں گے۔ اُس کا ذہن اُس کی یادداشت کو اس طرح صاف کر دیتا ہے جیسے کار کے شیشے کی پٹری (Wind Shield) بارش کے قطرے

صاف کر دیتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اُس کی یادداشت آتی جاتی رہتی ہے۔ اُس کے پاس دوائی کی گولیوں سے بھری ہوئی چار چھوٹی تھیلیاں ہیں اور وہ دوائیاں اُسے صبح ناشتہ سے پہلے، دوپہر کے کھانے کے ساتھ، بعد از دوپہر اور رات سونے سے پہلے کھانی ہوتی ہیں۔ مگر دوائی کھانے کے پانچ منٹوں کے بعد ہی وہ میرے پاس آ کر کہتی ہے کہ اُس نے ابھی دوائی نہیں کھائی۔ مجھے اکثر بتانا پڑتا ہے کہ اُس نے دوائی کھالی ہے مگر کبھی کبھار وہ مشتعل ہو کر کہتی رہتی ہے کہ اُس نے نہیں کھائی۔ خوش قسمتی سے گھر میں آ کر اُس کی دیکھ بھال اور روزمرہ کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لئے ماہر معاونین مہیا ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ اُس کو دیکھ بھال کے لئے کسی کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ سارا دن یہی کہتی رہتی ہے:

”میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں اور اُن کے ساتھ مل بیٹھ کر وقت گزارنا چاہتی ہوں۔“

چیزیں خریدنے کے لئے پہلے وہ باہر جانا پسند کرتی تھی، مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اُسے جوتوں کی دکان میں جانا اچھا لگتا ہے، گزشتہ دنوں ہم ایک دکان میں گئے اور وہاں اُس نے جوتوں کا ایک جوڑا اٹھالیا جو کہ ہو بہو ویسا تھا جیسا کہ اُس نے ایک ہفتہ پہلے خریدا تھا۔ دکاندار لڑکی کو بڑی مشکل سے اُسے یقین دلانا پڑا کہ بالکل ویسے جوتے وہ پہلے خرید چکی ہے۔ مجھ سے جتنا بھی ممکن ہو سکے میں ایسی دل توڑنے والی باتیں سہتا

رہتا ہوں۔

دوائیوں کے اثر سے بُشریٰ غیر جذباتی ہو گئی ہے۔ پہلے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا شروع کر دیا کرتی تھی۔ اکثر اوقات ضرورت سے زیادہ ہمدردی اور فراخ دلی کا اظہار بھی کیا کرتی تھی۔ اگر کوئی اُسے کہتا کہ وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہے اور خصوصاً اگر وہ اپنے ہی خاندان کا کوئی فرد ہوتا، تو وہ میرے پاس آ کر کہتی کہ میں اُس کی مالی امداد کروں۔

اب اُس کی یادداشت غیر مربوط ہو چکی ہے اور ہر روز بڑی مشکل سے گزرتا ہے۔ میری تو یہی اُمید اور دعا ہے کہ اُس کی حالت مزید خراب نہ ہو۔ اُس کی بیماری کی تحقیق کے لئے ہم نے سوچا تھا کہ مختلف تجرباتی علاج گاہوں سے رابطہ قائم کریں، لیکن وہ اس تحقیق کے لئے مناسب اُمیدوار نہیں ہے۔ کیونکہ ایک تو اُس کو انگریزی بولنے اور لکھنے پر عبور حاصل نہیں، دوسرے وہ کسی ہسپتال میں ایک لمبی مدت تک رہنا برداشت نہ کر سکے گی۔ دوائیوں کے ذریعہ اُس کی جسمانی کپکپاہٹ، درد اور بے چینی پر تو قابو پایا جاسکتا ہے، لیکن یادداشت کے معدوم ہونے سے نہیں بچایا جاسکتا۔

پارکنسن کی لا علاج بیماری کی وجہ سے ہمارے گھر کے تمام افراد بے حد پریشان ہیں۔ میری تو اپنی پوری کوشش یہی ہے کہ جب تک بُشریٰ کی یادداشت کی قوت باقی ہے میں زیادہ سے زیادہ وقت اُس کے ساتھ گزاروں اور میں اپنے تمام بچوں کو بھی یہی تاکید کرتا ہوں وہ اپنی امی کو ملنے آتے رہا کریں اور اُس کے ساتھ وقت گزاریں۔

ہمارے بچے انتہائی افسردگی میں مجھے کہتے ہیں:

”وہ جو ہماری امی ہوا کرتی تھی، اب تو وہ نہیں ہے۔ اب تو تم ہی ہماری

امی اور ہمارے ابا ہو۔“

لیکن مجھے یہ افسوس دامنگیر رہتا ہے کہ میں تو کوئی اچھا باپ نہ تھا، اور دنیا کا مشکل ترین کام، یعنی ماں کا کردار میں کیسے ادا کر سکتا ہوں! پھر بھی میں اپنے طور پر پوری کوشش کرتا ہوں کہ اب یہ دونوں ذمہ داریاں اچھی طرح سے نبھاسکوں۔ اور اُمید رکھتا ہوں کہ میری یہ کوشش کامیاب ہوگی۔

اس سے قبل بُشریٰ اکثر روتی رہتی اور کہتی تھی کہ اُس نے ضرور کوئی ایسا غلط کام کیا ہے جسکی اُس کو سزا مل رہی ہے۔ میں ہمیشہ اُس کی دل جوئی کرتا اور کہتا کہ یہ کسی غلط کام کی سزا نہیں ہے۔ مگر اب ادویات کے استعمال سے اُس کی وہ بیجانی کیفیت ختم ہو گئی ہے۔

مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اُسے واپس کینیڈا لے چلوں تاکہ وہ اپنے بھائی بہنوں کے قریب ہو جائے۔ لیکن پھر اس خیال کو ترک کرنا پڑا کیونکہ ہمارے سارے بچے یہاں ہو سٹن میں رہ رہے ہیں۔

اُس کی مرض کی تشخیص کے بعد میں نے اپنا زیادہ وقت اُس کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا ہے، لیکن پھر بھی میں تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنی کاروباری مصروفیات بھی کم کر دی ہیں اور زیادہ تر کام اپنے بیٹے یوسف اور داماد اعجاز

کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کی راہ میں کافی تاریک گڑھوں کا خدشہ ہے اور میں نے احتیاط کا پہلو اختیار کر رکھا ہے۔ اور کبھی کبھی ماضی کی خوشگوار یادیں تازہ کر لیتا ہوں۔ میرے سامنے بُشریٰ کا مستقبل ایک دھندلائی ہوئی شام کی مانند ہے اور اُس کی ایک پسپا ہوتی ہوئی زندگی ہے جس کا پوری طرح سے خیال رکھنا میں لازمی سمجھتا ہوں۔

بُشریٰ ہمیشہ ایک سادہ لوح اور بھولا بھالا سا انسان رہی ہے۔ بعض اوقات تو اُس کی سادگی مضحکہ خیزی کی حدوں کو چھو جایا کرتی تھی۔ لیکن یہ بھی اُس کے کردار کا ایک پیارا پہلو تھا۔ مگر اُس کی موجودہ سادگی اب پارکنسن کے ساتھ منسوب ہے۔

ممکن ہے کہ بُشریٰ کا فکر و اضطراب اس بیماری کا باعث بنا ہو۔ لیکن اس کی اصل وجہ کا ہمیں کبھی بھی پتہ نہیں چلے گا۔ اُس کی زندگی بچپن ہی سے کافی مشکل اور افسوسناک مراحل سے گزری تھی۔ اُسے اپنی مشکلات سے خلاصی حاصل کرنے کے کئی مواقع ہاتھ بھی آئے مگر اُس نے اُن سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اور وہ اپنے بچپن کے تکلیف دہ احساسات کو اپنے دل میں لئے ہوئے اُس وقت تک چلتی چلی گئی جب اُس کے اعصابی نظام نے مزید برداشت سے انکار کر دیا۔

اپنی جوانی میں بُشریٰ ایک فولادی خاتون تھی اور ہمیشہ اُس کی یہی کوشش رہی کہ اُس کے بچے پاکستانی رسم و رواج اپنائیں اور اُن کی پابندی کریں کہ جس طرح وہ خود اُن کی پابند رہی تھی۔ جب اُسکے بچے بڑے ہو گئے اور اُن کی شادیاں ہو گئیں تو اُس نے اپنی بیٹیوں کو واضح الفاظ میں نصیحت کی کہ وہ اپنے خاوندوں کا احترام کیا کریں اور صاف

سُتھری زندگی گزاریں۔ جب اُس کے داماد گھر آتے تو وہ اُن کا خاص خیال رکھا کرتی تھی۔ وہ زور سے صادیہ کو کہتی:

”اعجاز کے لئے جلدی سے چائے اور بسکٹ لے آؤ! جو بھی اُسے اچھا لگتا ہے، فوراً لے آؤ۔“

بُشریٰ کے دل میں دوسروں کی مدد کرنے کا ایک خاص جوش تھا۔ لوگ اُس پر اعتماد کرتے اور راز کی باتیں بھی اُسے بتا دیتے۔ اور وہ اُن کے راز ہمیشہ اخفاء میں رکھتی۔ دوسروں کے ساتھ کانا پھوسی کرنا اُسے پسند نہ تھا۔ وہ اپنے جاننے والوں کے لئے جو کہ ذاتی مشکلات سے گزر رہے ہوتے، ایک اچھی نا صحت تھی، اور اُن کی مشکلات کا حل نکالنے میں ان کی مدد کیا کرتی تھی۔ لیکن اب اُس کا غیر مصفا اور بچگانہ دماغ کسی کے راز کو مخفی نہیں رکھ سکتا۔ اور اُس کی بیماری کے اثرات ہم سب کی آنکھوں کے سامنے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ ساری باتیں دل توڑنے والی ہیں۔

میں اپنے روزمرہ کے اوقات ایک شکستہ دماغ کے ساتھ بیٹھ کر گزارتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا! آج بُشریٰ کو پہلے سے بہت زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی اس کو سہارا دے، وقت دے، اُس کے ساتھ رہے اور اُس کی دیکھ بھال کرے۔ ضروری ہے کہ اس کے رشتہ دار، دوست احباب اس کے پاس رہیں، باتیں کریں، باتیں سُنیں، ہنسی مذاق کریں اور اُس اکیلی جان کے ساتھ وقت گزاریں۔ وہ اپنے دل کی باتوں کا اظہار تو نہیں کر سکتی، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے قریبی رشتہ

داروں اور دوست احباب کی صحبت، محبت اور خبر گیری کی کمی کو محسوس کرتی ہے۔
 بُشریٰ کی سوچ رنگ بدلتے بلوروں کی مانند ہے جو کہ تغیر پذیر عکس پیدا کرنے والے آلہ Kaleidoscope میں کبھی یکجا ہو کر رنگین خوبصورت وضع اختیار کر لیتے ہیں اور پھر منتشر ہو کر بے ترتیب ٹکڑوں کی شکل میں بدل جاتے ہیں۔ اُس کی بیماری نے مجھے خود اپنی طرز زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اپنی انتہائی زیادہ مصروفیات کے باوجود مجھے اپنے بچوں کی زندگیوں میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیے تھی اور مجھے ان کو اپنا زیادہ وقت چاہیے تھا۔ اپنے پہلے دو بچوں کے لئے مجھے ایک خوفناک بھوت کی صورت نہیں رہنا چاہیے تھا جبکہ دوسرے دو چھوٹے بچوں کو میں نے زیادہ وقت دیا تھا۔ جب مغربی رسم و رواج کو اپنانے کی کشمکش سے بُشریٰ گزر رہی تھی، مجھے چاہیے تھا کہ میں اُسکی پُر زور اعانت کرتا اور بہت ممکن ہے کہ اس طرح وہ پارکنسن کی بیماری سے بھی محفوظ رہتی۔ اسی طرح مجھ کو پوری توجہ کے ساتھ اُس کو انگریزی لکھنا پڑھنا سیکھانا چاہیے تھا۔ علاوہ ازیں، اُس کے علاج معالجہ کے لئے مجھے اُس کو مختلف ماہرین علاج کے پاس لیجانا چاہیے تھا۔ مجھے...

مجھے ایسے بہت سے اندیشوں کے جواب شاید کبھی بھی نہ مل سکیں۔ بہر صورت میں اس اُمید و یقین پر قائم ہوں کہ اس خطرناک آفت کے پیچھے ضرور کوئی بڑی بھلائی پوشیدہ ہے۔ واللہ اَعْلَمُ بالصَّواب۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔



رہنمائی بذریعہ رجائیت

میں نے انتہائی انکساری کے ساتھ اس کتاب میں اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں، اور مجھے اُمید ہے کہ قارئین کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ بعض واقعات آپ کو فائدہ مند اور دلچسپ لگے ہوں گے، اور بعض باتوں کو آپ اپنا کر خود اپنی زندگی میں یا کسی دوسرے میں تبدیلی لانے کی کوشش کریں گے۔ میرے بعض تجربات آپ کو عقلمندانہ نظر آئیں گے اور بعض ایسے کہ جن کا آپ کی زندگی کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں ہوگا۔ بہر حال مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے آپ نے ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا ہوگا۔ اور میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ سے رخصت حاصل کروں، میں اپنے گھرانے کے مستقبل کے بارے میں اپنی پُر اُمیدی سے مطلع کرنا چاہتا ہوں۔ مستقبل روشن ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ کچے راستے والے ایک دُور دراز پاکستانی دیہات سے کہ جہاں بنیادی تعلیم حاصل کرنا بھی دشوار تھا، میں یہاں آیا اور طرح طرح کی مشکلات سے گزرتا

ہوا مغربی دُنیا میں تیل اور گیس کے ایک مضبوط کاروبار کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
 بُشریٰ اور میں اپنے بچوں کے لئے ایک مُستحکم مستقبل چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میری
 مُراد مال و دولت کی فراوانی نہیں، بلکہ محنت و مشقت، استقلال اور ہمہ تن یکسوئی سے کام
 کرنے کی قیمتی قدروں کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے گھر کے افراد کے علاوہ کئی دوسرے
 لوگ بھی جو زندگی کی راہ میں ملے، ہم نے اُن کے دلوں میں کامیاب زندگی گزارنے
 کے بعض بنیادی اصول بٹھا دیئے ہیں۔ اب یہاں میں کامیابی کے اُن اصولوں کا ذکر
 کرنا چاہتا ہوں:

1۔ آپ وقت کی پابندی کرنے کو اپنائیں اور زندگی میں جو مواقع بھی

دستیاب ہوں، اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح دوسروں کی
 نسبت آپ کا قدم آگے ہی رہے گا۔

2۔ کامیابیوں اور ناکامیوں کی راہ تیز قدموں سے طے کریں۔ اپنی

کامیابیوں پر مغرور نہ ہوں اور ناکامیوں پر شکستہ دل ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔

یہ آنی جانی ہیں۔ ہر ناکامی میں ایک پُر حکمت سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس

کے ذریعہ اگلی کامیابی کی تیاری کرنی چاہیے۔ میرا جب بھی کسی ناکامی

سے سامنا ہوا، یہی محسوس ہوا اس میں ضرور میرے لئے کسی بہتری کا

سامان ہے۔ اور میں آگے چلتا چلا گیا۔ اس لئے آپ اپنے ذہن کو

ناکامیوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار رکھیں، کیونکہ آپ کو کامیابی کی

- جانب لے جانے کے لئے یہی ایک طریق ہے۔
- 3- آپ پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ بیماروں اور بوڑھوں کی خدمت کے لئے وقت نکالیں۔ دل میں عاجزی، انکساری اور اخلاص کو ہمیشہ قائم رکھیں اور اپنی اوقات کو کبھی نہ بھولیں۔
- 4- اپنے ایمان پر مضبوطی سے قائم رہیں اور مستقبل کو رجائیت سے پُر نگاہ سے دیکھیں۔
- 5- آپ جانچ پرکھ کر خطرات مول لینا نہ بھولیں۔ بعض دفعہ آپ کا کام بن جائے گا اور بعض دفعہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن مستقل مزاجی سے مثبت رویہ اپنائے رکھیں۔
- 6- منکسر مزاجی کے ساتھ دوسروں کی رہنمائی کریں اور اپنے ملازمین، ساتھی کارکنوں، ماتحتوں اور جماعتی افراد کے لئے ایک مثالی نمونہ قائم کریں۔
- 7- ہمیشہ خاموشی کے ساتھ دوسروں کی دست گیری کرتے رہیں، اور کسی بدلے یا انعام کی اُمید کے بغیر اُن کی معاونت کریں۔ اور خصوصاً اُن لوگوں کا خیال رکھیں جنہوں نے کبھی آپ کی اعانت کی ہو۔
- 8- کسی کاروبار کی کامیابی اُس کے مالک کی شخصیت کا عکس ہوتی ہے۔ بعض دفعہ دل میں خیال آ سکتا ہے کہ کوئی مختصر راہ اختیار کر کے

جلدی سے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ لیکن میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مستقل مزاجی، دوراندیشی اور محنت کوشی ہی میں آپ کی بھلائی ہے۔ کیونکہ فوری کامیابی کے فوائد عارضی ہوتے ہیں۔

- 9- خواتین کا ہمیشہ ادب و احترام کریں اور ان کو ہنرمندانہ کام کرنے کی ترغیب دیں تاکہ وہ خود مختار ہوں اور رضا کارانہ خدمات بھی انجام دیں۔ اگر آپ ایک خاتون ہیں تو یاد رکھیں کہ آپ نوع انسان کی بنیادی اینٹ ہیں۔ آپ کو خداوند تعالیٰ نے صبر و محبت، وفا اور پُر جوشی کے خصوصی انعامات سے نوازا ہے اور یہ خوبیاں زندگی بھر ایک بیٹی، بیوی اور ماں کے روپ میں بہت بڑی مثبت قوت کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔
- 10- اگر آپ باہر سے امریکہ آئے ہیں تو پھر یہ لازمی ہے کہ آپ انگریزی بول چال سیکھیں، کار چلانا سیکھیں اور ایک مقصد کو اپنے سامنے رکھ کر اُس کے حصول کے لئے مستعدی سے کوشاں ہو جائیں۔ بے کار نہ بیٹھیں، کوئی کام تلاش کریں یا رضا کارانہ خدمات انجام دیں تاکہ آپ کا ذہن مصروف رہے اور آپ معاشرے کا ایک مفید وجود بن جائیں۔
- 11- اپنے والدین کے ساتھ نرمی اور پیار کا سلوک رکھیں۔ اور اسی طرح عمر رسیدہ لوگوں، بیماروں اور غریبوں کی خدمات بجالائیں۔

12- آپ کی زندگی چاہے کتنی بھی زیادہ مصروف ہو، آپ ہمیشہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

13- مادی دولت آنی جانی چیز ہے۔ جب تیل اور گیس کا کاروبار مشکل مرحلے سے گزر رہا تھا، میں نے بہت زیادہ مالی نقصان اٹھایا۔ اور جب میرا بڑا گھر طوفانی سیلاب میں زیرِ آب آ گیا تو میں نے مقدموں میں بھی شکست کھائی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ یہ تمام عارضی اور سرلیج الزوال حادثات تھے، میں زندگی کی دوڑ میں مضبوطی سے قائم رہا۔ بنیاد پکی ہونے کی بنا پر مجھے معلوم تھا کہ محنت اور مثبت رویہ کے ہاتھوں میں ان

مشکلات سے باہر نکل آؤں گا۔

جب 2014 میں انٹرنی کی پارکنس کی بیماری کی تشخیص ہوئی تو اس کے کچھ عرصہ کے بعد میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کر دی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنی داستان پیچھے چھوڑ جاؤں کہ جسے سب پڑھیں اور محفوظ ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری یادداشتیں میرے ذہن سے اتر جائیں۔

جس وقت میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی اس وقت ہم سب گھر والوں کی محبوب شخصیت پارکنس میں مبتلا ہو چکی تھی۔ 2014 کے اوائل میں جب انٹرنی کی بیماری کی تشخیص ہوئی تھی اس وقت ہمارے تمام بچے اپنی بڑی حویلی چھوڑ کر اپنی اپنی جداگانہ راہیں اختیار کر رہے تھے۔ ہم سب کے دلوں میں رنجشیں اور تنگی تھی اور ہمیں کچھ بھی اچھائی

نہیں دے رہا تھا کہ اس یکسر غیر متوقع حقیقت کا سامنا کس طرح کیا جائے۔ بیوی، ماں اور گھر کو چلانے والی شخصیت اب ایک ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا ہو چکی تھی۔

اس وقت جب میں یہ کتاب مکمل کر رہا ہوں، ہم سب ہسٹن میں ایک دوسرے سے چند منٹوں کے فاصلے پر رہ رہے ہیں، ہمارے بچے اور انکے بچے اکثر ہمیں ملنے آ جاتے ہیں۔ خصوصاً میری نواسیاں آفرین اور ایمان دونوں یہاں تالاب سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ بُشریٰ ہر روز کبھی میرے ساتھ یا اپنے بچوں کے ساتھ، یا تیمارداری کے لئے آنے والے کارندوں کے ہمراہ باہر چہل قدمی کے لئے چلی جاتی ہے، اور کبھی کبھی تالات کے قریب بیٹھ کر چھوٹے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھنے لگتی ہے۔

میرا موجودہ گھر ہمارے بچوں کیلئے ایک اجتماعی مرکز ہے۔ وہ یہاں آ کر ہمیں جذباتی سہارا دیتے ہیں۔ جبکہ ہم اس تکلیف دہ دور میں رجائیت کے ساتھ با حوصلہ گزر رہے ہیں۔

درحقیقت یہ کتاب تو اُس وقت شروع ہو چکی تھی جبکہ میں ایک نوجوان لڑکا تھا، اب میری عمر 66 سال ہے اور میں ذہنی طور پر بعض مشکل ترین مراحل سے گزر رہا ہوں۔ لیکن بہ فضلِ خدا صحت مند ہوں، مطمئن ہوں اور خداوند تعالیٰ کا ممنون و مشکور ہوں۔

بُشریٰ اور میری زندگی کی کامیابیاں، ناکامیاں، اجاگر خوشیاں اور غموں کی تاریکیاں تحریر میں لانا میرے لئے آسان نہ تھا۔ لیکن میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ ان حقائق کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے اور خود اپنی اور اپنے قریبی دوست احباب کی

زندگیوں میں ایک بہتر تبدیلی لانے کے لئے گہری سوچ کے ساتھ فیصلہ کر سکیں گے۔
 آجکل میرا بیٹا یوسف اور داماد اعجاز میرے ساتھ کام کر رہے ہیں تاکہ کاروبار کو
 مزید وسعت اور تقویت حاصل ہو۔ میرے تمام بچوں نے کسی نہ کسی رنگ میں میرے
 کاروبار میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اور تمام بچوں نے محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی بنا پر
 اپنا روشن مستقبل سنوار لیا ہے۔

وہ سب مغربی انداز میں غور و فکر کرتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ
 ہماری معاشرتی قدروں اور رسم و رواج کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور میری تمام
 مشکلات کے دوران ہمارے مددگار، خیال رکھنے والے اور محبت کا اظہار کرنے والے
 رہے ہیں۔ خدا کینیڈا اور امریکہ کو بھی جزائے خیر دے کہ ان ممالک نے مجھے ترقی کے
 زینوں پر چڑھنے کے مواقع فراہم کئے۔

خدا کے خاص فضل سے ہماری بڑی حویلی پوری طرح مرمت ہو کر ایک بار پھر
 سارے ساز و سامان سے آراستہ ہو چکی ہے۔ طوفانِ ہاروی تو ہماری پُرانی یادگاریں بہا
 کر لے گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں دوبارہ نئی یادگار چیزوں سے نوازا دیا ہے۔



محنت اور دلجمعی سے کام کا حاصل

سن 2000ء کے اوائل سالوں میں مجھے خیال آیا کہ زمین خرید کر اُسے ریچ (Ranch) کے طور پر استعمال کروں اور تحقیق کے بعد میں نے ٹیکساس میں ایک ریچ خرید لیا جس پر ہمارے تیل اور گیس کے کنوئیں بھی موجود تھے۔ یہ ریچ ٹیکساس کے قدرتی مناظر کی ایک خوبصورت آماجگاہ ہے۔ ہم اس جائیداد کا نام YC Ranch رکھا۔ کنوئیں کے علاوہ وہاں تین مکان ہیں اور کافی تعداد میں جنگلی جانور بھی ہیں جن میں پیرو، فاختائیں، بٹیر اور ہرن شامل ہیں۔ وہاں ایک جھیل بھی ہے جس میں بکثرت مچھلیاں پل رہی ہیں۔ یہ YC Ranch سترہ سو ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔

ریچ خریدنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے بہت سے دوست احباب شکار کے شوقین ہیں۔ اس طرح وہ ریچ اُن کے لئے مختلف جنگلی جانوروں کے شکار کے لئے ایک بہترین آماجگاہ بن گیا اور اُس ریچ کو ہم نے شکاریوں کا شوق پورا کرنے کے لئے مخصوص کر دیا۔

ہم نے وہاں ہرن کے شکار کے لئے 14 چبوترے، شکاریوں کے لئے چار پوشیدہ

نشست گاہیں اور جنگلی جانوروں کے لئے اٹھارہ خوراک گاہیں بنادی ہیں جہاں سے سارا سال اُن کو خوراک مہیا کی جاتی ہے تاکہ وہ تندرست اور توانا رہیں۔

چند سالوں سے ہم نے اس رینج میں مویشی بھی پالنے شروع کر دیئے ہیں اور اُن مویشیوں کے لئے رینج کا ایک حصہ مخصوص ہے جہاں وہ آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے مویشیوں کو کسی قسم کی مصنوعی خوراک نہیں دی جاتی بلکہ وہ قدرتی طور پر اُگا ہوا سبز گھاس بطور چارہ کھاتے ہیں۔ مجھے رینج کا کام اتنا پسند آیا کہ میں نے کینساس اور برٹش کولمبیا میں بھی رینج کی جائیدادیں خرید لیں۔

میری زندگی کی ابتداء ایک معمولی سے ماحول میں ہوئی تھی اس لئے مجھے اپنی زندگی کے بعض پہلی بار کئے ہوئے کام یاد آ جاتے ہیں جیسا کہ پہلی بار رینج کو دیکھنے پر میں نے خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا کہ ایک دن میرا اپنا بھی ایک رینج ہوگا۔ اسکے علاوہ دوسرے کئی کام میں نے پہلی بار کئے جن کے متعلق میں اپنی نوجوانی میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ کرسکوں گا۔ مثلاً:

✽ زیورات کی ایک دکان میں جا کر قیمت دیکھے بغیر بُشری کے لئے ایک انگوٹھی خرید لینا۔

✽ اپنے بیٹے یوسف کی شادی کی دعوت پر ہوائی کے ہیلکولانی ہوٹل میں پورے ایک ہفتہ بھر کے لئے بہترین طعام کا بندوبست کرنا اور اُس شادی میں شمولیت کے لئے اپنے پورے خاندان کو ہوائی لے جانا۔

چھٹیاں گزارنے کے لئے دنیا کے مختلف ممالک میں جا کر اخراجات کی پرواہ کئے بغیر وہاں کے مشہور ترین ہوٹلوں میں ٹھہرنا۔

✽ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے اب بینک کی ضرورت نہیں بلکہ بینک کو میری ضرورت ہے، پہلی بار ایک بینک میں داخل ہونا۔

✽ اپنے ارادہ کی تکمیل کی خاطر کہ جماعت احمدیہ کے لئے ایک عبادت گاہ تعمیر کروں جس سے وہ مستفید ہوں، ہوسٹن میں ایک شاہراہ کے کنارے پانچ ایکڑ زمین خرید کر ہدیہ کے طور پر پیش کرنا اور پھر اُس پر بیت السمع مسجد بنانا۔

✽ میری اپنی پسند کے مطابق بنی ہوئی پہلی Patek Philippe ہاتھ کی گھڑی خریدنے کے احساس سے لطف اندوز ہونا۔

✽ اپنی پسند کے مطابق بنائی گئی ایک نئی May Bach کار کو اُن ایام میں خریدنا جبکہ وہ 2000 کے اوائل کے سالوں میں ملک میں متعارف کی جا رہی تھی۔ لیکن اُس کار کو چلاتے وقت لوگوں کا میری طرف بغور متوجہ ہونا میرے لئے بے چینی کا باعث بن گیا۔ اور اُس کار کو صرف 350 میل چلانے کے بعد میں گیراج میں لاکھڑی کر دیتا۔

✽ اس کے علاوہ کئی دوسری عمدہ کاریں مثلاً پورشہ (Porsche)۔ فراری (Ferrari)۔ ماسراتی (Maserate)۔

لیمبورگنی (Lamborghini) اور ایک رینج روور ایس وی (Range

Rover SV بھی خریدیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں نے ان تمام کاروں کو

نہیں چلایا بلکہ اس المال کے طور پر سمجھا۔

یہ تمام باتیں محنت و مشقت اور ہمہ تنی کے نتائج پر گواہی دے رہی ہیں۔ چاہے کوئی بھی ہو، کسی بھی رنگ و نسل سے ہو، کہیں سے، کسی بھی پس منظر سے، کیسے ہی حالات میں یہاں آیا ہو، وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ خدا امریکہ پر اپنی رحمت فرمائے۔



حرفِ آخر

زندگی کے بہترین انعامات بلا معاوضہ ہیں

بُشریٰ کی بیماری نے اگر مجھے کچھ سکھایا ہے تو وہ یہ کہ دولت کے ساتھ خوشی نہیں خریدی جاسکتی۔ مجھے اگر خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ اپنے پیاروں کے ساتھ معنی خیز اور گہرے تعلقات قائم رکھنے سے ملتی ہے۔ میں اپنے خاندان کے افراد کو بہت زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

بُشریٰ کی سوچ سمجھ اگر چہ اب ویسی نہیں جیسے کہ پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ بچوں اور پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کے ساتھ بیٹھنے سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے بچے اپنے گھر والوں کے ساتھ اکثر ہمارے پاس آ جاتے ہیں اور ہم سب آپس میں مل بیٹھ کر باتیں کرنے اور گھر کے پکے ہوئے کھانوں کا مزہ لیتے ہیں۔

ہماری کھانے کی میز حالانکہ بہت بڑی ہے جس کے گرد ہم سب باسانی بیٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی ہم ناشتے کی چھوٹی میز کے گرد بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں ہمارے سارے بچے اور آگے اُن کے بچے اپنی اپنی گرسیاں گھسیٹ کر لے آتے ہیں

اور ہم سب ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں انہی جیسے اچھے وقتوں کی آئندہ بھی اُمید رکھتا ہوں۔

میری بڑی بیٹی صادیہ بہت نرم دل اور پیار کرنے والی ہے۔ بچپن ہی سے وہ ہمیشہ دوسروں کا بہت خیال رکھا کرتی تھی اور ابھی تک وہ انہی حیرت انگیز صفات کی حامل ہے۔ اعجاز کے ساتھ صادیہ کی شادی کے بعد اُس کے میاں شروع ہی سے ہمارے کاروبار میں میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ وہ بہت ہی ذہین ہیں اور اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے میں بہت خوشی ہوتی ہے۔

صادیہ اور اعجاز نے اپنے چار حیرت انگیز بچوں کی بہت اچھی پرورش کی ہے۔ اُن کی سب سے بڑی بیٹی رافعہ آنکھوں کی بیماریوں کے علاج کے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی ہے اور جلد ہی ایک دن وہ آنکھوں کے امراض کی ڈاکٹر (Optometrist) بن جائے گی۔ اُس کے بعد دوسری بیٹی حانیہ انڈرگریجویٹ ڈگری حاصل کر رہی ہے اور اُس کا ارادہ انجینئر بننے کا ہے۔

صادیہ کے دونوں بیٹوں، موسیٰ اور عیسیٰ نے اپنے خاندانی کاروبار میں کام کرنے میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ انشاء اللہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں کے دلوں میں اپنے بڑوں کے لئے ادب و احترام اور ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے جذبات ہیں۔

مجھے اس بات پر فخر اور بے حد خوشی ہے کہ میرے بچوں کے بچے جو بلوغ کی عمر کو

پہنچ چکے ہیں وہ سب ذہین اور محنتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جس مقصد کو بھی اپنے سامنے رکھیں گے، وہ اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرا سب سے بڑا بیٹا بابر آجکل کیلیفورنیا میں رہائش پزیر ہے تاکہ وہ اپنی بیٹی نور کے قریب ہو۔ بابر کی بیوی برشہ اپنی بیٹی کو ایک بہترین انسان بنانے کے لئے اُس کی اعلیٰ تربیت کر رہی ہے۔ میری پوتی نور ایک خوبصورت لڑکی ہے اور بے حد ذہین ہے۔ وہ کراٹے، باسکٹ بال اور مخصوص امریکی کھیل لاکراس (Lacrosse) کھیلنا پسند کرتی ہے۔

بابر ہمیشہ ہی تیز فہم رہا ہے اور پیشہ کے لحاظ سے اُس کی توجہ سافٹ ویئر پروگرامنگ (Software Programming) پر مرکوز رہی ہے۔ اور اس حیثیت سے اُس نے کئی تجارتی اداروں میں کام کیا ہے۔ آجکل ہی میں اُس نے تیل اور گیس کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے سافٹ ویئر اپلیکیشن (Software Application) ایجاد کی ہے۔ اور اسی طرح رہن و گروی سے متعلقہ صنعت (Mortgage Industry) کے لئے بھی سافٹ ویئر بنایا ہے۔

میری چھوٹی بیٹی ماریہ کا میرے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ اُس کی محبت بھری طبیعت اپنے اندر مزاج کا رنگ بھی رکھتی ہے اور وہ جواں سالی کی قوتِ محرکہ سے لبریز ہے۔ ماریہ میرے ساتھ ابھی بھی ویسی حرکتیں کرتی ہے کہ جیسے میں ایک نو عمر جوان ہوں۔ ماریہ کے میاں کا نام تھر ہے جو کہ ایک بہت نرم دل انسان ہے۔ ماریہ اور تھر کی دو خوبصورت بیٹیاں ہیں افرین اور ایمان۔ اور وہ دونوں اپنی معصومیت اور جوشیلے پن کی

وجہ سے ہمارے گھرانے کی خوشیوں کی جان ہیں اور میں اُس دن کا منتظر رہتا ہوں کہ کب وہ دونوں ہمارے ہاں آئیں گی اور ہمارے تالاب میں نہانے کے لئے بے تاب ہو جائیں گی۔ مجھے اُن کی اتنی چھوٹی عمر میں بھی بڑوں کے ادب و احترام اور ہر ایک سے پیار کرنے کی قدریں رچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور سچ مچ میں ایک بہت خوش نصیب نانا ہوں۔

میرے چھوٹے بیٹے یوسف نے اپنے کالج کے طالب علمی کے زمانہ ہی سے میرے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اُس چھوٹے سے لڑکے کو جو میری ٹانگ سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا تھا، بڑا ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اب وہ ایک ہوشیار، محنت کش بالغ انسان بن چکا ہے جو کہ ابھی تک خوشباش اور محبت آمیز طبیعت کا مالک ہے۔

یوسف نے ایک اچھی عادت یہ اپنائی ہے کہ وہ جلد دوسروں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے اور اُن کو اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ یوسف کی بیوی عنبرین ایک سمجھدار، ذہین اور خدا سے محبت کرنے والی خاتون ہے۔ عنبرین کی مہمان نوازی قابل ذکر ہے۔ اُسے کھانا پکانا اور دوسروں کی ضیافت کرنا بہت پسند ہے۔ یوسف اور عنبرین کی شادی کو ابھی تھوڑی مدت ہی ہوئی ہے۔ اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ بُشریٰ نے اپنے پیارے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی بھی دیکھ لی ہے۔

جب یوسف کی شادی ہوئی اور اُس نے اپنا گھر بسایا، اُس وقت اُس کی یادداشت قدرے قائم تھی۔ یہ بات اُس کے لئے انتہائی خوشی کا باعث تھی کہ اُس کے تمام بچوں کی

شادیاں ہو گئی ہیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو چکے ہیں۔
اپنے گھرانے کے علاوہ میرے دوسرے قریبی رشتہ دار سارے شمالی امریکہ میں
آباد ہیں۔ میرے تمام بھائی بہن امریکہ میں ہیں اور ہمیں جب بھی موقع ملتا ہے ہم
سب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ہمارا آپس میں رابطہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

میرا بھائی عزیز کیلیفورنیا میں رہتا ہے اور وہ اپنے اوقات کو اپنے کاروبار کے مختلف
مقامات کے درمیان تقسیم کرتا رہتا ہے۔ عزیز کا بیٹا ہسٹن میں رہ رہا ہے اور اُس کی بیٹی
کیلگری میں۔ میری بہن مشہ ڈلس ٹیکساس میں اور اُس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی ڈلس
ہی میں رہتے ہیں اور ایک بیٹا آسٹن میں۔ میری چھوٹی بہن سیمہ، سانٹا مار یا
کیلیفورنیا میں، اور سیمہ کے تینوں بیٹے بھی کیلیفورنیا میں رہائش پزیر ہیں۔ میرے تینوں
بھائی بہنوں اور اُن کے تمام بچوں میں سے ہر ایک کو اپنے اور اپنے گھرانوں کے لئے
مستحکم روزگار مہیا ہیں۔

بُشریٰ کے بھائی بہن، جن کے ساتھ میرا قریبی تعلق قائم ہے، سب وینکوور کینیڈا
میں رہ رہے ہیں، اور بُشریٰ کی بیماری کے مشکل ایام کے دوران مجھے اُن کی وجہ سے
بہت آرام اور سہارا ملتا رہتا۔ میں اپنی زندگی میں اُن سب کی موجودگی پر بے حد ممنون
ہوں۔

میرے کئی خالہ اور چچا زاد بھی ہیں جو نیوجرسی میں رہتے ہیں۔ جب بھی موقع
ملے مجھے اُن سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مجھ پر خداوند تعالیٰ کا یہ ایک بہت بڑا

احسان ہے کہ مجھے اتنے زیادہ مہربان اور خیر خواہ رشتہ دار نصیب ہیں۔ میرے قریبی اور دُور کے رشتہ دار میرے لئے ایک بہت بڑا سہارا بنے رہے ہیں اور ہم سب اکثر یک جا ہو کر وقت گزارتے ہیں اور میرے لئے وہی اوقات حقیقی انعاماتِ خداوندی ہیں۔



میرے عزیز واقارب کی آراء

میرے والد محترم یونس چوہدری صاحب

(صادیہ رحمان)

میرے والد کو بہت سے لوگ ایک مشہور تاجر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن میرے واسطے وہ ایک ایسا شخص ہے کہ جس کے ساتھ میری زندگی کے تقریباً تمام لمحات شامل حال رہے ہیں اور جن سے میں ہمیشہ لطف و اندوز ہوتی رہی ہوں۔

جس دلی جذبہ کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی اپنے کاموں کے لئے وقف کی ہوئی ہے اُس نے اُس کے بچوں اور پھر آگے اُن کے بچوں کے لئے کامیابی کی راہیں کھول دی ہیں اور یہی صحیح معنوں میں 'امریکی خواب' کی سچی تعبیر ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں میرے والد کی توجہ مختلف سمتوں پر مرکوز رہی، لیکن اُس کا کام کرنے کا جوش و جذبہ بڑی مضبوطی کے ساتھ مستقل طور پر قائم رہا۔

ہر دیکھنے والے کو اُس کا جذبہ و جوش اور کامیابی تو نظر آتی ہے، لیکن اُس کے ساتھ

نرمی کا گوشہ بھی ہے اور وہ اُس کی روح اور جذبات میں مُضمّن ہے۔ میری خاطر اُس نے جو کچھ بھی کیا ہے، میں زندگی بھر اُس کی ممنون احسان رہوں گی۔ اُس کی شفقت کی لہریں تمام افرادِ خانہ نے محسوس کی ہیں، جن کے بغیر انہیں وہ کامیا بیاں نصیب نہ ہوتیں جو اب انہیں حاصل ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ ہم سب اُس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ہمارے لئے محبت و مسرت کا ایک محور ہے۔

بد قسمتی سے میرے والد کے لئے زندگی اتنی آسان نہیں رہی۔ میں اپنی والدہ کی بیماری کی بنا پر اُسے مختلف اقسام کی مُشکلات کا سامنا کرتے ہوئے دیکھتی ہوں، لیکن اُس نے اُمید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور اُس نے آس کے نور کی کرن کو ہمیشہ تھامے رکھا۔ جس بے غرضانہ طور پر اُس نے میری والدہ کی محبت بھری دیکھ بھال کی ہے بہت ہی کم لوگ ایسے ہونگے جنہوں نے ایسا کیا ہو۔

میری دُعا ہے کہ اُس کی خوبیوں اور کامیابیوں کی یادداشت صرف ایک کامیاب و کامگار بیوپاری کے طور پر ہی باقی نہ رہے، بلکہ اُسے ایک باپ، نانا اور دادا کی حیثیت سے بھی یاد رکھا جائے جس نے ہم سب کو کامیابی کے رُخ پر لگایا۔ وہ شخص جس نے تمام مُشکلات کے باوجود پورے خاندان کو باہمی محبت اور ادب و احترام کی خوبیوں سے آراستہ کیا ہے۔



میرے والد محترم یونس چوہدری صاحب (بابر چوہدری)

دوسروں کی نظر میں میرا والد ایک کامیاب بیوپاری، انسان دوست، اپنے خاندان کا سربراہ اور ہر لحاظ سے ایک اچھا آدمی ہے، لیکن ان باتوں سے ہٹ کر میری نظر میں ایک ایسا انسان ہے جو کہ بے انتہا مشکل مراحل میں اپنی بیوی کا ہمدم رہا ہے۔ میں ایک ایسے انسان کو دیکھتا ہوں کہ چاہے کتنا ہی مالی یا جذباتی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے، وہ اصول کی پابندی کرتا ہے۔ جتنا میں نے اُس کی زندگی کی کہانی سے سیکھا ہے، اُس سے زیادہ میں نے کہیں اور سے نہیں سیکھا۔

ایک پاکستانی نوجوان جو امریکہ آکر پروان چڑھا، اُس نے مجھے وہ بنیادی اصول سکھائے جن کی بدولت میں وہ انسان بن گیا ہوں جو کہ آج میں ہوں۔ زندگی کی یہ کہانی جسے آپ نے مطالعہ کیا ہے، اس کو پڑھنے سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ بہت ساری مشکلات کا مجھے کچھ اندازہ تو تھا جن میں سے میرے والد کو گزرنا پڑا، لیکن اُن کی تفصیل پڑھنے کے بعد ہی مجھے اُن کی اصل حقیقت سمجھ آئی۔

مجھے اب جا کر معلوم ہوا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ کیوں مجھے دس صفحے ہاتھ سے

لکھنے کو کہا کرتا تھا کیونکہ میرے ہاتھ کی لکھائی انتہائی گندی تھی، اور کیوں مجھے گھر کی طرف دوڑ کر جانے کو کہا کرتا تھا اور خود میرے ساتھ ساتھ کار چلاتا ہوا آتا تھا۔ میں اپنے باپ ہی کا بیٹا ہوں اور اس کی بعض عادات مجھ میں بھی ہمیشہ کے لئے سرایت کر گئی ہیں چاہے مجھے ان کا علم ہو یا نہ ہو۔ بعض عادات نے میری زندگی میں مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے، جیسے بلند حوصلگی، محنت و مشقت اور اصولوں کی پابندی۔

اور بعض باتیں زرا عجیب سی بھی ہیں۔ مثلاً میں اپنی جیبوں میں بلا وجہ بہت سارے نیپکن ٹھونس لیا کرتا ہوں اور یہی کام ہمارے والد صاحب کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک بہت ہی غیر معمولی انسان کی زندگی کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھلتے ہوئے دیکھا ہے۔

ہمارے والد نے ہمیں انکساری سے رہنا سکھایا۔ اگر میں Air Jordan کے قیمتی جوتے خریدنا چاہتا تو مجھے کے جوتے پہننے کو ملتے۔ اُس وقت تو مجھے صدمہ پہنچتا، مگر اب جو میں ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو سمجھ آتی Payless ہے کہ اُس نے مجھے کتنا قیمتی سبق سکھایا تھا۔ اپنے بچے جو بھی چاہیں وہ اُن کو خرید کر دے دینا بڑا آسان کام ہے۔ میں یہ اس لئے جانتا ہوں کہ اب میرے اپنے بچے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ انکی خواہشیں بآسانی پوری کی جاسکتی ہیں۔ اپنا فون اُن کے حوالے کر دینا، اُن کو ویڈیو گیمز کھیلنے دینا، وہ خود فیصلہ کریں کہ کس وقت سونا ہے، مگر نہیں۔ میرے والد کا یہ طریقہ نہ تھا۔ اُس نے اپنا وقت نکال کر مجھے یہ قیمتی اسباق سکھانے کی پوری کوشش کی اور یہی کام مشکل

ہے، اور یہ وہ باتیں ہیں جو میں اپنے والد کے متعلق جانتا ہوں۔ اُس نے کبھی بھی آسان راہ اختیار نہیں کی۔ اُس نے کبھی بھی آنکھیں بند کر کے آسان طریق نہیں اپنایا۔ وہ ہر ایک کام مسلسل کئے جاتا رہا ہے۔ اُس نے مجھے کبھی بھی بد دل ہو کر نہیں چھوڑا، ہمیشہ مجھے سمجھاتا رہا، میری پوری تربیت کی اور حقیقتاً وہ ایک ایسا انسان ہے جس سے میں نے بے حد فیضان حاصل کیا ہے۔ یہ کتاب میری پیاری والدہ کے اعزاز میں لکھی گئی ہے۔ میں ایک ایسے گھرانے میں بڑا ہوا ہوں جہاں بہت سی خواتین تھیں لیکن میں نے اپنی والدہ سے زیادہ مستحکم اور با اثر خاتون کوئی بھی نہیں دیکھی۔ اُس کی انتہائی نقصان رساں بیماری کے دوران میرے والد نے جس طرح میری والدہ کو سنبھالا ہے، اُس کے زیر اثر مجھے خود اپنی ذاتی ذمہ داریوں پر نظر ثانی کرنے کا موقع ملا۔ میرا والد ہمیشہ ہی سکھلاتا رہتا ہے۔



میرے والد محترم یونس چوہدری صاحب

(ماریہ چوہدری)

اپنی عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میں اپنے بچپن کے بارے میں سوچتی ہوں کہ کس طرح ہم نے پاکستانی اور امریکی تہذیبوں کو باہم ملا دیا تھا۔ بعض حصوں میں دونوں تہذیبوں کے بندھن آپس میں مضبوطی سے جڑ گئے تھے اور بعض حصوں میں خلا باقی رہ گئے تھے، لیکن پھر بھی تمام تانے بانے آپس میں بندھے ہوئے تھے جنہوں نے میرے کردار کی ساخت میں حصہ لیا۔

میں تو یہ کہوں گی کہ میرے والدین نے اپنی دانست کے مطابق جو ذرائع بھی اُن کو مہیا تھے، اُن کا بہترین استعمال کیا۔ میرا والد ہر وقت کام میں لگن رہتا تھا اور ہم اپنی والدہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لیکن جو وقت بھی میں اپنے والد کے ساتھ گزارتی مجھے یہی یاد ہے کہ اُس میں گرمجوشی تو تھی لیکن وہ اپنے ساتھ بہت زیادہ چمٹا کر نہ رکھتا تھا۔ اُسے کامیابی حاصل کرنے اور کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ بنانے کے لئے اندھا دھند کام کرنے کا جوش و جذبہ تھا۔

اُسکے کام کرنے کی خوش اصولی کو عزت کی نگاہ سے دیکھے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ وہ

ٹرمینٹر (Terminator) کے مماثل ہے۔ ترقی کا ایک زینہ طے کرنے کے بعد اگلے زینے پر قدم رکھنے کا جذبہ ہر وقت کارفرما رہتا ہے۔

ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری زندگی ایک مضبوط چمکدار سفید فصیل کے اندر رہتے ہوئے گزری اور ہم میں سے کوئی بھی اُس میں دراڑیں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری والدہ ایک فولادی ارادے والی سخت گیر منظمہ خاتون تھی اور میرے خیال میں اُس کے پس پشت کوئی تکلیف دہ واقعہ ہو گزرا تھا اور ایسے تکلیف دہ واقعہ کے اثرات کبھی بھی منہدم نہیں ہوتے اور بے ساختہ طور پر دماغ کو متاثر کر دیتے ہیں اور ذہنی افراتفری کا باعث بن جاتے ہیں۔

میں اپنے بچپن میں اپنے والد کے بہت قریب اور شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ لیکن اُس نے ہمیشہ ہی مجھے یہ احساس دلایا کہ میں جیسی بھی ہوں، اچھی ہوں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ میں اپنی والدہ کے اور معاشرتی طور طریقوں کے بنائے ہوئے ڈھانچے میں ڈھل کر اپنی زندگی بسر کروں۔ جب میں ذرا اور بڑی ہوئی تو میرے والد نے میری حوصلہ افزائی کی کہ مجھے اپنے ذاتی جذبات اور نظریات کے پیش نظر اپنی زندگی میں مزید وسعت پیدا کرنی چاہیے اور اُسی محدود راستہ پر ہی نہ چلتی جاؤں جو کہ میری والدہ، ہمیشہ اور خاندان کی اور بہت ساری عورتوں نے اپنایا ہوا تھا۔

بہت سے تعلقات میں اچھا وقت بھی آتا ہے اور بُرا وقت بھی اور گھناؤنا وقت بھی آ جاتا۔ ہمارے باپ بیٹی کے تعلقات میں بھی ایک ایسا وقت آیا جب ہمارے درمیان

نفاق کی گھاٹیاں بہت گہری ہو گئی تھیں اور غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے درمیان باہمی آرزو دہ دلی آگئی تھی۔ وہ ایک انتہائی تکلیف دہ وقت تھا۔ میں شکر کرتی ہوں کہ وہ اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ اور کبھی کبھار ایسا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ ایسا وقت گزرنے کے بعد ہمارے درمیان ایک صحت مندانہ تعلق دوبارہ استوار ہو گیا۔

میرے والد نے میرے گھرانے کے مستقبل کے لئے حال ہی میں بہت ساری تبدیلیاں لائی ہیں اور اُن میں سے بعض فیصلے اور چارہ جوئیاں آسان نہ تھیں اور جیسا ہونا چاہیے تھا ویسا نہ ہوا لیکن پھر بھی میرا والد مضبوطی سے اپنے فیصلوں پر قائم رہا اور جو تبدیلیاں بھی میرے والد نے لائیں میں اُن کی قدر کرتی ہوں۔

بعض لوگوں کے لئے وہ تیل کا ایک بیوپاری ہے جس نے خالی ہاتھوں بہت کچھ بنا لیا۔ لیکن میرے لئے وہ ایک بہت ٹھنڈے دل والا شفیق باپ ہے جس کے چہرہ پر ہمیشہ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ رہتی ہے۔ وہ ایک طرف ہو کر اُس کھیل کا نظارہ کرتا ہے جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ بابا جی! آؤ اور خوشدلی میں شامل ہو جاؤ!



ایک مثالی باپ اور مثالی خاوند

(یوسف چوہدری)

اس سے پہلے میرے بھائی بہن میرے والد کی شخصیت کو بہت عمدہ پیرائے میں بیان کر چکے ہیں، اور میرے خیال میں جو انہوں نے کہا ہے میں اُس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ مسلسل کام کرنے کے اعلیٰ اخلاقی معیاروں کا پابند، محنت و مشقت کے حیرت انگیز ولولے کا مالک، غیر متزلزل، سب کی خیر خواہی چاہنے والا اور تجسس نہ نکتہ شناسی کا گرویدہ شخص ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ والد محترم یونس چوہدری کی سیرت کے نرم اور پوشیدہ پہلوؤں پر بات کروں جن کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا خوش کن موقع مجھے اُس وقت نصیب ہوا جبکہ میں بطور ان کے بیٹے کے بڑا ہو رہا تھا۔

اکثر لوگ جو میرے والد کو جانتے ہیں اُن کو وہ ایک حیران کن باکمال تاجر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایک کامیاب بیوپاری کے تصور سے ہٹ کر اگر وہ ذاتی طور پر اُسے جاننا چاہیں تو اُن کو پتہ چلے گا کہ وہ اُس کے ساتھ باسانی بات چیت کر سکتے ہیں اور وہ اپنے گرد و نواح کے لوگوں کا دلی خیر خواہ ہے۔

گذشتہ دنوں میرا ایک قریبی کزن ہوٹلن آیا تھا اور اُسے میرے والد کے ساتھ

بہت اچھا وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اور میرے خیال میں اُس نے ایک قابلِ تعریف حقیقت پر انگلی رکھ دی کہ جب اُس نے کہا:

”میں اپنی تمام زندگی چچا یونس سے دُور دُور رہا ہوں کیونکہ وہ ہر وقت کسی کام میں مصروف رہتے تھے اور میں اُن سے ملتے ہوئے خوفِ محسوس کرتا تھا۔ لیکن جب میری اُن کے ساتھ بات چیت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ تو ایک ایسا آدمی ہے جس کی طبیعت میں مزاح بھی ہے اور وہ نرم دل بھی ہے۔ اور جس کی نظر چھوٹی چھوٹی باتوں کی گہرائی تک اُتر جاتی ہے۔“

جب میں نے اُس سے پوچھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی گہرائی سے اُس کا کیا مطلب ہے تو اُس نے مجھے بتایا:

جب ہم اُس کے گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو نو عمر بچے اپنی اپیل (Apple) گھڑیوں کے متعلق باتیں کرنے لگے جو اُن کو بہت پسند تھیں، لیکن میں اُن کی گفتگو میں شامل نہیں تھا اور خاموش بیٹھا ہوا تھا کیونکہ میرے پاس اپیل گھڑی نہیں تھی۔ اُس وقت چچا یونس نے مجھے وہاں سے اُٹھایا اور اپنے ساتھ قریب ہی ایک اپیل گھڑیوں کی دکان پر لے گئے اور مجھے ایک اپیل گھڑی خرید کر لے دی، اور ساتھ ہی یہ کہا کہ کسی کو بھی اس بات کا پتہ نہ چلے!“

میرے والد کی اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گہری نظر رکھنے کے متعلق لوگ آگاہ نہیں ہیں۔ لیکن اُس کی نظر ایسی باتوں پر پڑتی ہے کیونکہ اُس کے دل میں لوگوں کی خیر خواہی کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ جب میں نے اپنے کزن سے پوچھا کہ اب میرے والد کے متعلق اُس کا کیا خیال ہے؟ تو اُس نے جواب دیا:

”میں اس بات پر حیران ہوں کہ یہ جاننے کے لئے مجھے اتنا زیادہ عرصہ لگا کہ درحقیقت وہ کیسا انسان ہے، حالانکہ میں اتنے عرصہ سے اُس کے قریب رہ رہا تھا۔“

ایک چیز جو باقی تمام باتوں سے بڑھ کر سامنے آتی ہے وہ میرے والد کی غیر متزلزل تیمارداری کی صفت ہے جبکہ میری والدہ کی صحت انتہائی طور پر گر چکی ہے۔ جب سے میری والدہ کی جسمانی اور دماغی صحت خراب ہونی شروع ہوئی ہے کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ میرا والد اُس کے پاس نہ ہو۔ میں اور میرے بھائی بہن ہم سب پوری کوشش کرتے ہیں کہ اپنی والدہ سے ملنے جائیں لیکن ہمارا والد شب و روز اُس کے پاس ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے سُنہرے ایام میں بھی خیال رکھا کہ ہماری والدہ کو زندگی کی بہترین سہولتیں میسر رہیں چاہے اس کے لئے اُس کو خود اپنا آرام قربان کرنا پڑے۔

مجھ پر ایک ناقابل یقین فضل ہے کہ میں ایک ایسے شخص کی قربت میں پل کر بڑا ہوا ہوں جس نے مجھے ایک مستحکم تاجر بننے کی قدر سکھلائی۔ اُس نے مجھے یہ بھی دکھایا کہ ایک شریف النفس انسان اور فعال رہنما بننے کے کیا معنی ہیں۔ جب میں اپنے والد

کے ساتھ کام کرتے ہوئے بڑا ہورہا تھا تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے، مگر آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ وہ ایک کامیاب تاجر ہے اور ہر ایک کارکن سے بہترین کام کی توقع رکھتا تھا، لیکن کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیتا تھا کہ وہ اُسکے ماتحت ایک ملازم ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ماتحت اعلیٰ افسران سے لیکر صفائی کرنے والے نوکر تک ہر ایک سے انتہائی کشادہ دلی کے ساتھ سلوک کرتا ہے اور اُس کے اس وصف سے میں ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔ کام کے دوران مجھ سے بھی کئی غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن میرے والد نے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور پوری تسلی کر لی کہ میں وہ غلطی دوبارہ نہ کروں۔

میرے والد نے ہمیشہ مجھے ڈالر کی قدر و قیمت سکھائی اور اپنی تمام مالی کامیابیوں کے باوجود وہ اپنی کمائی کو فضول خرچی سے بچائے رکھتا ہے۔ آج بھی وہ اُسی حجام کے پاس جاتا ہے جو کہ اُس کی بال کٹائی کے صرف دس ڈالر لیتا ہے۔ اور اپنی کار میں گیس شہر کے گرد و نواحی علاقوں میں جا کر ڈلواتا ہے کہ جہاں گیس کی قیمت ذرا سستی ہوتی ہے۔ سرسری نظر میں تو یہ کفایت شعاری غیر ضروری محسوس ہوتی ہے، لیکن میرے والد کی طبیعت کا ایک حیران کن تضاد ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذات پر بامشکل ہی کچھ خرچ کرے گا لیکن دوسری طرف اوروں پر بے تحاشہ صرف کر دیگا۔ اپنے والد کے متعلق ہم سب بھائی بہنوں کی متفقہ رائے یہی ہے کہ اُس نے ہمیں کبھی بھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت پیش آئی اور میرا مطلب ہے کہ کسی بھی چیز

کی تو وہ نہ صرف ہماری مدد کرتا ہے، بلکہ بگاڑ دینے کی حد تک ہم پر خرچ کر دیتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب بھی ہم اُس پر زور ڈالتے ہیں کہ وہ اپنی ذات پر بھی خرچ کرے تو وہ ہمیشہ مسکرا کر جواب دیتا ہے کہ: ”دینا بہتر ہے، لینے سے!“

یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ یونس چوہدری میرا ناصح، مثالی انسان، بہترین دوست اور والد ہے۔ میری پوری کوشش یہی ہے کہ میں اُس کی مکمل تقلید کروں اور آئندہ بھی ایسا ہی کرتا رہوں اور مجھے اُمید ہے کہ اپنے والد اور والدہ کی خواہش کے مطابق میں بھی اُسی کے مانند ہو جاؤں۔ یونس چوہدری جس قسم کا انسان ہے اور جن خوبیوں کا مجسم ہے اگر میں اُس کا ایک چوتھائی حصہ بھی پالوں تو میں سمجھوں گا میں نے جو کچھ کیا، درست کیا۔



ایک مزاحیہ انسان

(نشا۔ یونس چوہدری کی بڑی بہن)

یونس ہمیشہ سے ہی ایک مزاحیہ، ملنسار اور بامروت بھائی رہا ہے۔ وہ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے اور جب وہ بڑا ہو رہا تھا تو مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات وہ اپنی ضد پراٹھ جایا کرتا تھا۔ ہمارے والد اُسے کہتے کہ اتالیق کے پاس جاؤ اور جا کر سبق پڑھو، لیکن کبھی کبھی وہ وہاں سے غائب ہو جاتا اور فلمیں دیکھ آیا کرتا تھا۔ وہ ہمارے والد کو تنگ بھی کیا کرتا تھا کیونکہ اسکول کی پڑھائی میں اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔

ہمارے والدین نے اپنے سب بچوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا، حالانکہ ہم پُرانے خیالات کے ایک مشرقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہماری بڑی آزادانہ تربیت کی اور عورت مرد کی جنسی تفریق کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی، اور اپنے بیٹے بیٹیوں دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا۔ ہمارے بھائی ایک لحاظ سے ہمارے محافظ بھی تھے اور کوئی لڑکا ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔

اپنی پڑھائی کے دوران یونس اسکول میں قدرے کمزور تھا اور گھر میں کبوتروں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ اُس کی شادی بھی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے ارادے میں

بہت مضبوط اور ایک عالی ہمت انسان ہے۔ ہمارا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا، لیکن یونس ہمیشہ محنت سے کام کرنے اور اپنے کاروبار کو پختہ بنیادوں پر قائم رکھنے میں یقین رکھتا تھا۔

بعد میں جب اُن کے بچے ہو گئے تو بُشریٰ اور یونس نے پہلے تو یہی کوشش کی کہ اُن سب کو ایک مشترکہ گھرانے میں رکھا جائے۔ اُن کے برعکس ہم نے اپنے بچوں کی اس طور پر پرورش کی کہ ایک دن وہ ہم سب سے الگ ہو کر رہیں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں افرادِ خانہ عام طور پر مل جُل کر رہنا پسند کرتے تھے۔ لیکن یہاں ایک دن آخر تک آ کر ہمارے بچے ہمیں چھوڑ جائیں گے۔ پھر یہ بھی کہ ہمارے والد کو اُن کے مذہب کی وجہ سے حکومت پاکستان نے ایک سنگدل مجرم کے طور پر قید خانے میں ڈال دیا تھا اور اُس واقعہ سے بھی ہماری زندگیاں کافی متاثر ہوئی تھیں۔

یونس نے اب اپنی تمام زندگی بُشریٰ کے لئے وقف کر دی ہوئی ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی خاوند کو اپنی بیوی کی اتنی زیادہ خدمت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کاش کہ تمام مرد ایسے ہی ہوتے۔ یونس کبھی بھی کوئی کام اپنی ذاتی سہولت کے لئے نہیں کرتا اور اس بارہ میں میں ہمیشہ فکر مند رہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے بُشریٰ کی بیماری کا علاج ناممکن ہے، اس لئے یونس کو اپنا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے۔



میرے بھائی یونس کے بارہ میں چند باتیں

(عزیز چوہدری)

جب ہم بڑے ہو رہے تھے تو یونس اور میں آپس میں اتنے زیادہ قریب نہ تھے۔ میں بورڈنگ سکول سرگودھا میں دس سے پندرہ سال تک رہا تھا۔ جب میں صرف چار پانچ سال کا تھا، اُس وقت سے گھر سے باہر رہ رہا تھا۔ جب میں واپس آیا تو اُس وقت تک ہم دونوں اپنے بچپن کو خیر باد کہہ چکے تھے اور یونس ساہیوال کے ایک گاؤں میں رہ رہا تھا۔

1963 میں جبکہ میری عمر سولہ سال تھی، ہم کچھ عرصہ ساتھ رہے، لیکن وہ مدت بالکل مختصر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہمارے والد نے گاؤں سے نکل کر شہر میں جا بسنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُن دنوں یونس ابھی اسکول کا طالب علم تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ایک ضدی لڑکا تھا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہمارا والد اُسے اسکول پیدل بھیجتا تھا۔ اُس کے برعکس میں پاکستان ایئر فورس کے ایک بہت مشہور اسکول میں داخل تھا اور پندرہ سال کی عمر میں میں نے گلائڈ رائڈر انا بھی شروع کر دیا تھا۔

یونس اور میری طرز پرورش میں اتنا زیادہ تضاد تھا کہ میرے خیال میں ہم دونوں

بالکل جداگانہ ذہنیت کے ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے ہمارا باہمی تعلق جلد قائم نہ ہو سکا۔ عمر کے لحاظ سے بڑا ہونے کی وجہ سے سہیلیاں بنانے میں بھی ہمارا مقابلہ تھا اور میرے خیال میں اس وجہ سے ہمارے دلوں کچھ حسد بھی پیدا ہو گیا تھا۔

جب ہم بڑے ہو رہے تھے تو ہم دونوں ہی خاموش طبع تھے اور اُس کی وجہ میرے خیال میں یہ تھی کہ ہماری پرورش کے دوران گھر میں ہمیں خارج بین ہونے کی کوئی تربیت نہ دی گئی تھی۔ وہ ضدی تو تھا مگر جس کام کو کرنے پر کمر باندھ لیتا اُس پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور اُسے پورا یقین ہوتا وہ ہر کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔

ہمارا آپس میں کبھی بھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا اور ہم اپنے اپنے دوستوں کے جتنوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ ہمارے پروان چڑھنے کے دوران ہمارے والد نے ہم دونوں کو یکساں تعلیمی مواقع نہ مہیا کئے۔ اُس کی خواہش تھی کہ میں سرگودھا جا کر اعلیٰ معیاری تعلیم حاصل کروں۔ لیکن یونس کو عمومی پبلک اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ اور بلاشبہ اس رویہ میں ایک واضح تفاوت تھا۔ بالخصوص جب ہم گاؤں آگئے اور پھر فرید ناؤن میں، تو وہاں اچھے تعلیمی مواقع محدود تھے۔ بہر حال جس معاشرے میں ہم رہ رہے تھے اُس کے پیش نظر بڑے بیٹے یا سب سے پہلے بچے کا غیر معمولی طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔

مجھے ایڈمنٹن میں اُس کے آنے کا پہلا دن تو یاد نہیں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت تیز طرار، سمجھدار اور حوصلہ مند تھا اور جلد ہی اُس نے اپنے لئے روزگار ڈھونڈ لیا۔ شلم برگر کمپنی میں میری اچھی ملازمت تھی لیکن یونس کو اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا تھا جس کے لئے اس نے بہت سارے دلچسپ کام کئے۔ اپنی آمدن بڑھانے کے لئے اُس نے کاریں بیچنا بھی شروع کر دیں تھیں۔ میرے خیال میں خرید و فروخت میں مہارت حاصل کرنے کے لئے وہ ایک مفید بنیادی تجربہ تھا۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ کام جس میں اُس نے شاندار کامیابی حاصل کی وہ گھر گھر جا کر تقریباً چھ سو ڈالر کی قیمت کے برتن بیچنا تھا۔ میں اب بھی حیران ہوتا ہوں کہ کس طرح وہ بغیر اطلاع دیئے دروازے کھٹکھا کر یہ کام کر لیا کرتا تھا!

درحقیقت وہ ایک خاموش طبع آدمی تھا مگر بہت جلد اُس نے اپنی کاروباری جبلت کو بیدار کر لیا۔ وہ جس کام پر بھی ہاتھ ڈالتا، اُسے ہمیشہ پوری توجہ کے ساتھ سر انجام دیتا۔ اُس نے کینساس میں جا کر زمینداروں کی زمینیں کرایہ پر لینے کا کام بہت کامیابی سے شروع کیا جس کو ہم آگے کینیڈین سرمایہ داروں کو فروخت کر دیا کرتے تھے۔ اُس نے اُس کاروبار میں بہت محنت سے کام کیا۔

بعض اوقات صنعتی حقوق کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل بولیاں بھی دیا کرتے تھے۔ بہر صورت ہم دونوں کے درمیان ایک صحت مندانہ باہمی تعلق قائم رہا۔ سن آئل کارپوریشن سے تیل نکالنے کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش نے اُسکے تیل

اور گیس نکالنے کے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ مجھے وہ ”نیل کتاب“ ابھی تک یاد ہے جس میں تیل اور گیس کی ان املاک کی فہرست تھی جو کہ فروخت پر لگی ہوئی تھیں اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی درج تھیں، جس نے اُس کے کاروبار کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا تھا۔

یونس ایک بہت ہوشمند بیوپاری ہے اور بیوپار کرتے وقت اخلاقی قدروں کی پابندی کرتا ہے جو کہ بے حد ضروری امر ہے۔ علاوہ ازیں، جب وہ کسی چیز کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر پوری تندہی سے اُسکے حصول کی جدوجہد کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم دونوں نے مل کر سعی کی ہوتی تو اس سے بھی بہت بڑی تجارت کے مالک ہوتے، لیکن جو کچھ بھی ہے میں اس پر بے حد خوش ہوں۔ میں اب بھی سوچتا ہوں کہ اگر میں نے اُس کی بعض باتیں مان لی ہوتیں اور بعض سودے کرتے وقت اُن کی پابندی کی ہوتی تو وہ میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوتیں۔

ہم دونوں کی مشترکہ ابتدا ایک معمولی گھرانے سے ہوئی تھی اور بعد میں ہم جداگانہ راستوں پر چل نکلے۔ ہم نے ہمیشہ اخلاقی اصولوں کی پابندی کی ہے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ مذہبی طور پر ہم دونوں احمدی مسلمان ہیں اور میں ابھی تک تیل اور گیس کے کاروبار ہوں اور میرا کام انڈونیشیا اور کینیڈا کے علاقوں میں ہے۔



میرے بھائی یونس کے بارہ میں چند باتیں

(سیما سیفی - یونس چوہدری کی چھوٹی بہن)

میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور اکثر اکیلی ہی کھیلا کرتی تھی۔ یونس میرے ساتھ بہت اچھا تھا اور وہ عزیز سے بہتر تھا کیونکہ وہ مجھ سے ناراض بھی ہو جایا کرتا تھا۔ یونس نے میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں اپنا ٹخنہ توڑ بیٹھی تو اُس نے مجھے اٹھالیا اور ہمارے چچا کے گھر لے گیا جو کہ ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ ہمارے بچپن کے زمانے کی مجھے کوئی خراب بات یاد نہیں۔ لیکن جب بڑے ہوئے تو 1984ء میں میرے والد کو حراست میں لے لیا جانا سارے گھرانے کے لئے ایک بہت بھاری صدمہ تھا۔ اُس واقعہ سے صرف ایک دن پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسکول کی چھٹیوں میں بچوں کے ساتھ میں واپس گھر جاؤں گی۔ والد صاحب کی حراست سے ایک دن پہلے ہم پاکستان پہنچے تھے اور مجھے سخت صدمہ پہنچا اور میں بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہماری دادی وفات پا گئیں۔ شکر ہے ہمارے والد نے اُن کی تدفین کے اور دوسرے تمام انتظامات پہلے ہی سے کئے ہوئے تھے۔ لیکن ظالم حکومت نے انہیں اپنی والدہ کے جنازے اور تدفین میں شمولیت کی اجازت نہ دی۔

اُن دنوں ہم سب پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ خصوصاً اپنے والد کوزنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنا جو کہ اُس کے پاؤں کے گرد باندھی گئی تھیں ناقابل برداشت تھا۔ یہ وہ یادیں ہیں جن کو میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتی۔ میرے دونوں بھائی وہاں پہنچ گئے تھے اور اُس کی رہائی کی خاطر اُن تھک کوشش کر رہے تھے۔ میرے والد سے کوئی جرم سرزد نہ ہوا تھا۔ اُس کو صرف اس لئے قید میں ڈال دیا گیا تھا کہ وہ ایک احمدی مسلمان ہے۔

یونس اپنی نوجوانی کے ایام میں بہت ہنس مکھ اور ہمدرد تھا اور جب وہ چھوٹا تھا تو گانے بھی گایا کرتا تھا۔ اُس کا سب سے قریبی دوست خالد صُبہائی مرحوم تھا اور وہ دونوں آپس میں مل کر کھیلتے رہتے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میری ایک بہت اچھی سہیلی پر اُس کا دل بھی آ گیا تھا۔ میں اتنی چھوٹی اور سادہ تھی کہ یونس مجھے مٹھائی خریدنے کے لئے باہر بھیج دیا کرتا تھا تا کہ وہ دونوں آپس میں اکیلے رہ جائیں۔

گذشتہ دنوں میں نے اُسے دیکھا کہ اُس کے لئے بُشریٰ کی تکلیف تباہ کن ہے۔ بُشریٰ انتہائی طور پر نفیس تھی اور میں اُس کی موجودہ حالت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ پاکستان میں بہت لمبے عرصہ تک وہ ہمارے ساتھ رہی تھی اور سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے میں اُس پر بہت انحصار کیا کرتی تھی۔

یونس اب کافی سنجیدہ نظر آتا ہے اور اب وہ نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اپنے طور پر وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ حسب معمول زندگی گزارے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ جان لے گا کہ بُشریٰ کی صحت کی موجودہ حالت کو بحال نہیں کیا جا سکتا۔



وہ (یونس) مستقبل کی پیشگوئی کر سکتا ہے

(جان گلبرٹ - 24 سال سے ملازم)

مسٹر گلبرٹ نے اوکلاہوما یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اس کو میدانی علاقوں میں تیل اور گیس کے کام کا وسیع تجربہ ہے۔ اس نے شیوران یو ایس اے میں چوبیس سال تک اعلیٰ حیثیتوں میں کام کیا ہے۔ 1990ء میں شیوران سے جلدی ریٹائرمنٹ لینے کے بعد اس نے یونس چوہدری کی کمپنیوں میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

میں یونس کو گزشتہ پچیس سالوں سے جانتا ہوں۔ پچھلی دو دہائیاں کام کے لحاظ سے میری بہت اچھی گزریں ہیں۔ یونس کے ساتھ مل کر کام کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت ہوشمند اور دوراندیش انسان ہے اور مستقبل میں واقع ہونے والی باتوں کا وہ بخوبی اندازہ لگا لیتا ہے۔ اُس کی یادداشت بھی زبردست ہے اور کاروباری میدان کے سارے کاموں کی تمام تفصیلات سے خوب واقف ہے۔ یہ انتہائی حیران کن بات ہے کہ اس کے علم میں وہ تمام باتیں ہیں جو علم طبقات الارض کے ماہرین کا کام ہے۔ مزید یہ کہ کاغذات پر نظر دوڑا کر کہتا ہے کہ بعض نتائج بالکل غلط نکالے گئے ہیں۔ وہ اعداد و شمار کو

متوازن رکھنے میں ماہر ہے۔ ایک ہی نظر میں غلطیاں نکال لیتا ہے اور حساب کتاب درست رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں میں پائیر (Pioneer) کمپنی نے اپنا کام مختلف سمتوں میں پھیلا کر جائیدادوں کی خرید و فروخت بھی شروع کر دی ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک مناسب عملی تدبیر تھی۔ ہر ایک کاروبار کا اپنا ایک دُور ہوتا ہے، جب ایک کام زوال پزیر ہونا شروع ہو جائے تو دوسرے کے ترقی پزیر ہونے کے امکان ہوتے ہیں۔ ایک کاروباری انسان کی حیثیت سے یونس میں تین نمایاں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بہت عقلمند ہے۔ دُور اندیشی سے مستقبل پر نظر رکھتا ہے، اور تیل اور گیس کی صنعت پر اُسے مکمل عبور حاصل ہے۔ ان باتوں کے علاوہ اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ صنعتی جائیدادوں کی قانونی دستاویزات اور اجارہ داری پر عبور اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ارضیات اور انجینئرنگ کے علوم ہیں۔

جہاں تک خطرہ مول لینے کا سوال ہے، یونس اس بارے میں کافی محتاط تاجر ہے۔ اُس میں مستقبل کو دیکھنے سمجھنے کی اہلیت ہے اس لئے بعض اوقات لوگوں کے خیال میں اُس کا فیصلہ غلط ہوتا ہے، لیکن انجام کار اُس کا کہا ہی درست ثابت ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر بہت اچھی طرح سے کام کرتا ہے اس لئے وہ سب اُس کا دلی احترام کرتے ہیں۔ اُس کا سلوک اپنے ملازمین کے ساتھ بہت اچھا ہے اور وہ ان سب کا بہت خیال رکھتا ہے۔

یونس کی دُور اندیشی اور ہوشمندی نے اُسے گزشتہ چالیس سالوں میں دیوالا نکلنے سے بچائے رکھا۔ جب بھی کوئی مالی مسئلہ درپیش ہو، تو وہ اُس کا حل نکل لیتا ہے۔ اُسے مشکل معاملات کو ہموار کرنا آتا ہے اور اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ خرابی پیدا ہونے سے پہلے کسی سودے سے کس طرح ہٹا لینا چاہیے۔

وہ ایک مضبوط اور اعلیٰ اخلاقی معیار کے مطابق کام کرتا ہے۔ اور اگر کسی کام کو تکمیل تک پہنچانا ہو تو وہ آخر وقت تک اُس کام میں لگن رہتا ہے اور پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ اپنے کام کرنے والوں سے بھی اچھے اخلاقی معیار قائم رکھنے کی توقع رکھتا ہے۔

میں یونس کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں اور میرے دل میں اس کے لئے بے حد زیادہ قدر ہے۔ میں نے تعلیم یافتہ لوگوں، انجینئروں اور بڑی بڑی تیل اور گیس کی کمپنیوں کے اعلیٰ افسران کے ساتھ بھی کام کیا ہے اور میں یونس کو گلف آئل آپریشن (Gulf Oil Operation) کے پریزیڈنٹ سے بھی اونچا درجہ دیتا ہوں، وہ ایک ایسا فرد ہے جس کے ساتھ مل کر میں نے کام کیا، جس نے ترقی کے زینے طے کئے اور جسے اپنے کاروبار کی تمام باتوں کا علم ہے۔

یونس اپنے لوگوں کا بہت خیال رکھتا ہے اور وہ بھی اُس کا خیال رکھتے ہیں اور کام کے دوران ایک بہت ہی پیارا گھریلو ماحول کا سماں بندھا رہتا ہے۔



ایک مہربان و مددگار انسان

(شیرن - 11 سال سے ملازم)

ایک بات جو میں یونس کے متعلق کہہ سکتی ہوں وہ یہ ہے کہ میں یہاں گیارہ سال کام نہ کر سکتی اگر وہ ایک عظیم انسان نہ ہوتا جس کے ساتھ مل کر میں کام کر رہی ہوں۔ یہاں میں نے فرنٹ ڈیسک پر کام کرنا شروع کیا تھا، پھر تنخواہ کی ادائیگی کے شعبہ میں کام کیا۔ اور اس کے بعد HR کے شعبہ میں۔

گذشتہ سال تک جبکہ کمپنی ہوسٹن کے شہر میں منتقل نہ ہوئی تھی، مجھے روزانہ ایک گھنٹہ یک طرفہ سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن چونکہ یونس کے لئے کام پر آنا ہوتا تھا اسلئے مجھے بہت خوشی ہوتی تھی کیونکہ وہ ایک بہت ہی اچھا اہلکار ہے۔ بہر حال اب بھی مجھے تھوڑا سفر کرنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی میری یہاں کام کرنے کی خوشی اُسی طرح بحال ہے۔

ایک ایسے شخص کے لئے کام پر آنا بہت مسرت کا باعث ہے جو اپنے ملازمین کا قدر دان ہو اور اُن کے کاموں کا مداح ہو۔ وہ ایک نرم دل، سخی اور سب سے زیادہ حقیقت پسند اور باعمل انسان ہے۔ اکثر بڑی بڑی کمپنیوں کے ناظمین اعلیٰ سے ملازمین کی ملاقات نہیں ہوتی۔ اور اُن سے فرداً فرداً بات چیت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن اس لحاظ سے یونس بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ وہ اپنے تمام ملازمین کا خیر خواہ ہے۔ اور اغلباً یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم ملازمین اُسے چھوڑ کر کہیں اور جاتے ہیں۔ ہم سب کے لئے چھٹی کے ایام تو بہت اچھے ہو جاتے ہیں۔ چھٹیوں کے موسم میں روزِ اوّل سے لیکر نئے سال کی آمد تک یونس اپنے ملازمین کے لئے روزانہ کھانا لاتا ہے اور ہر روز کھانا مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ بات آپ کو اکثر کاروباری اداروں میں نظر نہیں آئے گی۔

علاوہ ازیں، وہ ہر ایک کی بات کو خوب غور سے سُنتا ہے، چاہے آپ اپنی چھٹیوں کے بارے میں بات کر رہے ہوں کہ کیسے گزریں تھیں، یا اپنے بچوں کی کرتوتوں کا قصہ سنارہے ہوں، وہ آپ کی بات کو پوری تفصیل سے سُنتا ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ آپ کس جگہ اپنی کمپنی کے ناظمِ اعلیٰ کو اپنے بچوں کے قصے سنائیں اور وہ پوری دلچسپی سے آپ کی باتیں سنے گا !

شاید یہ خوبیاں یونس کی ایک عاجزانہ ابتداء کی وجہ سے ہیں اور اس حقیقت کی بنا پر ہیں کہ وہ ایک خود ساختہ شخص ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ملازمین کے ساتھ ہم آہنگ رہتا ہے۔ اور وہ ایک عظیم انسان ہے جس کے ماتحت میں کام کرتی ہوں۔



وہ (یونس) خواتین کو کامیابی کی راہ پر چلانے میں مددگار

(سنٹھیا-12 سال سے ملازم)

بارہ سال پہلے جب میں یونس کے لئے کام کرنے آئی تو مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ میرا کام دفتر میں لوگوں کا استقبال کرنا تھا جو کہ سب سے نچلے درجہ کی ملازمت ہے جسے اکثر اوقات نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اور یقیناً مجھے یہ قطعاً امید نہ تھی کہ کمپنی کا اعلیٰ افسر میرے ساتھ اپنی بیٹی کی طرح سلوک کرے گا۔ لیکن درحقیقت یہی ہوا اور وہی سلوک آج تک جاری ہے۔

یونس صرف ایک ناظم اعلیٰ ہی نہیں، بلکہ اُس سے بہت بڑھ کر ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے ناداری کی حالت سے نکل کر بڑھتے بڑھتے بے انتہاء کامیابی حاصل کی اور آپ ایک ایسے کامیاب شخص سے یہی توقع رکھ سکتے ہیں کہ اُس تک پہنچ ایک مشکل امر ہوگا اور وہ لا پرواہ بھی ہوگا۔ لیکن یونس بالکل ایسا نہیں۔ وہ بے حد مؤدب ہے اور ہر ایک ملازم کی اُس تک پہنچ ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ نچلی سطح سے ابھر کر بڑے بڑے کام کیسے کیے جاتے ہیں اور وہ نچلی سطح سے اوپری سطح کے سب ملازمین کو موقع دیتا ہے تاکہ اُن کو محسوس ہو کہ اُن کی قدر کی جا رہی ہے اور اُن کی ضرورت ہے۔

یقیناً وہ میرے ساتھ اپنی بیٹی کی طرح سلوک کرتا ہے۔
 بلاشبہ وہ ایک انتہائی محنتی شخص ہے اور اپنے ملازمین سے بھی وہ یہی توقع رکھتا ہے،
 اور وہ انکو انکی محنت کا صلہ بھی دیتا ہے۔ آجکل کے زمانے میں یہ بھی آسان نہیں کہ ایک
 ایسا ناظم اعلیٰ میسر آ جائے جو نہ صرف خواتین کو کامیابی کی راہ پر چلانے کے لئے کوشاں
 ہو بلکہ درحقیقت اُن کے لئے ایک ایسا ماحول بھی مہیا کر دے کہ وہ کامیابی حاصل کر
 سکیں۔ اور یہ ایک غیر معمولی اور انتہائی قابلِ تعریف بات ہے۔
 میرے خیال میں میں نے سب سے اچھا سبق جو یونس سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ
 اگر کوئی کام خراب ہو جائے، یا کوئی دن خراب گزر رہا ہو تو اس کے دانشمندانہ الفاظ ہمیشہ
 یہی ہوتے ہیں:

اس کو دل و دماغ سے نکال دو اور کل کی صبح از سر نو شروع کرو۔ تمہارے
 خون کا دباؤ تمہارا شکر گزار ہوگا۔“

ایسے شخص کے لئے کام کرنا جو اپنے تمام ملازمین کا اتنا زیادہ خیال رکھتا ہو اور اُن
 کے ساتھ اتنے ادب کے ساتھ سلوک کرتا ہو، بے شک ایک انتہائی خوش گن بات ہے
 اور ہر روز کام پر آنا خوشگوار ہو جاتا ہے۔



YBC Foundation

(یونس اینڈ بُشری چوہدری فاؤنڈیشن)

14 جون 2014 میری زندگی کا ایک تاریک دن تھا۔ اُس دن مجھے اپنی بیوی بُشری کو پارکنسن مرض ہونے کی تشخیص کی اطلاع ملی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے حالات پر گہری نظر دوڑائی اور اپنی یادوں کو اس کتاب میں قلمبند کر دیا ہے۔

ذاتی طور پر میں بُشری کی بیماری سے انتہائی طور پر متاثر ہوا ہوں اس لئے اس کتاب کی فروخت سے ملنے والی تمام آمدن یونس اینڈ بُشری چوہدری فاؤنڈیشن کو پیش کردی جائیگی جو کہ معمر اور بیمار لوگوں کو کسی دوسرے پر انحصار کئے بغیر ایک معززانہ زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرے گی۔

وہ تمام وسائل جو مجھے بُشری کی تیمارداری کے لئے حاصل ہیں میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔ لیکن ہوسٹل میں لا تعداد ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب اُن پر پارکنسن یا الزائمر جیسی مہلک بیماری کا حملہ ہوتا ہے تو وہ کسی ایسی جگہ نہیں جاسکتے جہاں وہ اپنی زندگی کے اچھے معیار کو قائم رکھ سکیں۔

2004ء میں یونس اینڈ بُشری چوہدری فاؤنڈیشن اس بات پر یقین رکھتے ہوئے

قائم کی گئی تھی کہ ہر انسان کا عزت و احترام اور محبت کے ساتھ خیال رکھا جانا چاہیے۔ اس لئے اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام رقم غریب اور معمر لوگوں کی امداد پر صرف ہوگی جو ہسٹن اور دوسرے علاقوں میں رہائش پزیر ہیں۔

یونس اینڈ بشری چوہدری فاؤنڈیشن کے تمام تراخراجات اٹھانا میری ذمہ داری ہے۔ اور مجھے اُمید ہے جو احباب اس کتاب کو خریدیں گے اور میری زندگی کا مطالعہ کریں گے وہ خلوص دل کے ساتھ یونس اینڈ بشری چوہدری فاؤنڈیشن کے امدادی کام کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے عطیات پیش کریں گے۔

یونس اینڈ بشری چوہدری فاؤنڈیشن 3 (C) 501 ایک خیراتی ادارہ ہے۔ اس میں دئے جانے والے تمام عطیات قانونی طور پر ٹیکس کی ادائیگی سے زیادہ تفریق کئے جا سکتے ہیں۔ (Federal EIN: 20-049199)

اگر آپ یونس اینڈ بشری فاؤنڈیشن کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں تو آن لائن <http://ybcfoundation.com> پر جائیے۔ اور اگر آپ کا اپنے عطیات یا اس کتاب یا یونس اینڈ بشری چوہدری فاؤنڈیشن کے متعلق کوئی سوال ہو تو براہ مہربانی info@ybcfoundation.com کا استعمال کیجئے۔





”محنت سے نعمت تک“ یونس چودھری کی زندگی کی ایک دل افروز اور سچی کہانی ہے جو کہ پاکستان کے ایک دُور دراز گاؤں میں بڑا ہوا تھا اور اُس نے ہوشمندی، محنت، عمل پیہم اور مُستقل مزاجی سے امریکہ اور کینیڈا میں کئی کامیاب کاروبار شروع کئے۔ 1973 میں جب وہ ایڈمانٹن پہنچا تھا تو اُس وقت اُسکی جیب میں صرف تیس ڈالرز تھے۔ لیکن اُس نے کمرتوڑ جانشانی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اور تمام مُشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے کامیابی کے زینے چڑھتا چلا گیا۔

بعد میں اس کی زندگی میں ایک انتہائی تکلیف دہ سانحہ پیش آیا اور اُس کی بیوی پارکنسن کے علاوہ مرض میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن خلافِ توقع درآمدہ مشکلات کے باوجود یونس نے خود کو تیل اور گیس کے سیماب پا کار و بار میں ایک دُور اندیش کامیاب بیوپاری کے طور پر قائم رکھا۔

یہ کتاب اُن تمام احباب کے مطالعہ کے لئے بے حد مفید ہے جنہوں نے کبھی بھی اپنے آپ یا اپنی قابلیتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ اُس کتاب کا پیغام بالکل سادہ ہے: مُستقل مزاجی، توازن اور خود اعتمادی کے ساتھ کام کو تکمیل تک پہنچانا۔ اس پیغام پر عمل پیرا ہو کر آپ بھی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ آسان پیرایہ میں یونس کی کامیابی کا راز ان خصوصیات پر مُشمول ہے: محنت، مثبت سوچ، توازن اور اُمید کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

”محنت سے نعمت تک“ ہمیں دیکھاتی ہے کہ کس طرح ایک شخص نے دنیا میں مضبوط قدم جمائے جس کے پاس صرف تیس ڈالرز اور ایک خواب تھا اور اُس نے کبھی بھی پسپائی کا خوف نہ کھایا۔ اس کتاب کی فروخت کی تمام آمدن یونس اینڈ بُشری فاؤنڈیشن کو جائے گی جو کہ ایک خیراتی ادارہ ہے۔ اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے آپ رابطہ قائم کریں:

Find more about Younas Chaudhary:

<http://ybcfoundation.com> Email: info@ybcfoundation.com

[in https://www.linkedin.com/in/younas-chaudhary/](https://www.linkedin.com/in/younas-chaudhary/)

محنت سے نعمت تک

یونس چودھری